قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

نومبر 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

''لَا نَبِیَّ بَعْدِیْ'' (الحدیث) حضرت محمد ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ باطل ہے



اے بسا شاعر کہ بعد از مرگ زاد
چشمِ خود بربست و چشمِ ما کشاد

(اکثر شاعر اپنے مرنے کے بعد پیدا ہوئے ہیں، انہوں نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور ہماری آنکھیں کھول دیں)

(تمہید، اسرارِ خودی، اقبالؔ)

کنونشن 2018ء

28 اکتوبر بروز اتوار منعقد ہوگا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

نومبر 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 11

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: روحِ اقبالؒ کب مطمئن ہوگی؟	ادارہ	4
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	پرویزؒ	6
ریاستِ مدینہ اس کی اہمیت اور اس کی انتظامی ساخت	خواجہ ازہر عباس، کراچی	20
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	30
قرآنی معاشرہ	عمر احمد عثمانی مرحوم	37
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا، نشست نمبر: 11	محمد علی صابر صدیقی	47
عالمِ افلاک اور قرآنِ عظیم	ڈاکٹر عبدالودود	50

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت

ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق

خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ

پاکستان: 550 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ

بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ

رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ENGLISH SECTION

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل) Chapter 3: Spring's Message**

(*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) – Message to Fellow-Ambassadors

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam) **60**

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)

Phone: 042-35714546

Cell: 0321-4460787

idarati@gmail.com www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore

For Domestic Transactions

Bank A/C No: 0465004073177672

For International Transactions

IBAN:PK36NBPA0465004073177672

Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

تو رازِ کن فکاں ہے، اپنی آنکھوں پر عیاں ہو جا
خودی کا راز داں ہو جا، خدا کا ترجماں ہو جا
ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا، محبت کی زباں ہو جا
یہ ہندی، وہ خراسانی، یہ افغانی، وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل! اچھل کر بے کراں ہو جا
غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم! اڑنے سے پہلے پرفشاں ہو جا
خودی میں ڈوب جا غافل! یہ سر زندگانی ہے
نکل کر حلقۂ شام و سحر سے جاوداں ہو جا
مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پرنیاں ہو جا
گزر جا بن کے سیل تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا
ترے علم و محبت کی نہیں ہے انتہا کوئی
نہیں ہے تجھ سے بڑھ کر سازِ فطرت میں نوا کوئی

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

ادارہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

لمعات

روحِ اقبالؒ کب مطمئن ہوگی؟

ایک مفکر کے پیغام کی عظمت اور اس کی خدمات کی اہمیت کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ اس نے قوم کے قلب و نگاہ میں کس قسم کا اور کس قدر انقلاب پیدا کیا۔ اس پیمانے سے ماپئے تو دور دور تک نگاہ دوڑانے سے بھی اقبالؒ کا ہمسر نہیں ملتا۔ مذہبی نقطہ نگاہ سے مصلحین (ریفارمرز) اور بھی کئی نظر آئیں گے لیکن ان کی نگاہ یا دسترس شجرِ اسلام کی شاخ تراشی تک محدود رہی۔ یہ اقبالؒ تھا جس کی دوررس اور ژرف بین نگاہ اس کی اصل و بنیاد تک پہنچی۔ اس نے کہا کہ سوال اِس خرابی یا اُس خرابی کا نہیں۔ ہمارا مروجہ اسلام، سرے سے حقیقی اسلام ہے ہی نہیں۔ یہ وہ سکہ ہے جو ہمارے دورِ ملوکیت کے ٹکسالوں میں ڈھلا اور ہماری مذہبی پیشوائیت کے صرافہ میں جس کا چلن ہے۔ جب تک اس اسلام کو حقیقی اسلام سے بدلا نہیں جائے گا، شجرِ ملت کی کوئی شاخ نہ سرسبز و شاداب ہو گی نہ بارآور۔ یہ اسلام، قرآن مجید کے دفتین میں محفوظ (اور اب ملفوف) ہے۔ بنابریں اس نے ملت اسلامیہ سے کہا کہ ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

یعنی اگر تو مسلمان کی زندگی بسر کرنا چاہتا ہے تو اس کی اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ تو قرآن کے مطابق معاشرہ قائم کرے۔

اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ آسان کام نہیں۔ اسلام کو مذہبی پیشوائیت کے چنگل سے چھڑانے کا فریضہ وہی شخص سرانجام دے سکے گا جو، جرأت و بسالتِ فاروقیؓ کے ساتھ اس انقلاب آفریں نعرہ کو لے کر اٹھے کہ۔۔ حسبنا کتاب اللہ۔۔ ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے۔ پھر اقبالؒ ان مفکرین میں سے نہیں تھا جن کا نام محض نظریات بہم پہنچانا ہوتا ہے۔ اس نے یہ انقلاب آفریں نظریہ پیش کیا اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اسے عملاً متشکل کرنے کی کیا صورت ہو گی۔ اس نے (1930ء کے خطبۂ صدارت میں کہا کہ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ایک ایسا خطۂ زمین حاصل کیا جائے جس میں مروجہ اسلام مملکتی حیثیت سے پہلے سے رائج نہ ہو۔ وہاں صدرِ اول کے سے قرآنی اسلام کو عملاً نافذ کیا جاسکے گا۔

یہ ہیں اس شمعِ بصیرتِ قرآنی کی ضوفشانیوں کے چند مختصر سے گوشے جو اس حکیمِ انقلاب نے شبستانِ ملت میں روشن کی۔ یہ مایوس اور شکست خوردہ قوم اس بانگِ رحیل سے ایک نیا ذوقِ سفر لے کر اٹھی اور نشاۃ ثانیہ کی امنگیں اور عزائم سینے میں لئے آزادی اور استقلال کی حقیقی منزل پر جادہ پیما ہوگئی۔ اس کی منزل اقوامِ عالم میں سب سے انوکھی منزل تھی اور اس کا ذوقِ سفر امتیازی خصوصیت کا حامل۔ چند سالوں میں یہ کاروانِ شوق اپنی منزل تک پہنچ گیا۔ لیکن یہ منزل آخری منزل نہیں تھی۔ منتہیٰ و مقصود ایک خطۂ زمین کا حصول نہیں تھا، بلکہ اقبالؒ کے اپنے الفاظ میں مقصود یہ تھا کہ وہ ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانونِ الٰہی کے تابع ہو جو نبوتِ محمدیہ ﷺ کو بارگاہِ الٰہی سے عطا ہوا تھا۔

''نورِ توحید کا یہ اتمام'' ابھی باقی ہے اور جب تک یہ ممکن نہ ہوا قبالؒ کی روح مطمئن اور مسرور نہیں ہوگی۔

قرآنِ کریم کا اِنسائیکلوپیڈیا

قرآنِ مجید انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لئے ضابطۂ ہدایت ہے لیکن اس کا انداز یہ نہیں کہ وہ ایک موضوع کے متعلق ایک ہی جگہ سب کچھ بیان کردے۔ اس کے متعلق وہ مختلف مقامات پر تفصیلات دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے احکام و قوانین کے سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ آپ کو معلوم ہو کہ ان کے متعلق اس نے کہاں کہاں، کیا کیا کہا ہے۔ لیکن قرآن کریم پر ایسی وسیع نگاہ رکھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔

مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب نے اس مشکل کو ہمارے لئے حل کردیا ہے۔ انہوں نے چالیس سال کی محنتِ شاقہ سے قرآنِ مجید کا ایسا انسائیکلو پیڈیا مرتب کردیا جس میں قریب دو ہزار چار سو عنوانات میں سے ہر ایک کے متعلق قرآنی آیات کے حوالے دے دیئے ہیں۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے قرآنی تعلیمات کو (Classify) کردیا۔

اس عظیم الشان علمی و تحقیقی کتاب

تبویب القرآن

کا نیا اور کمپیوٹر کمپوزڈ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

کمپیوٹر کمپوزنگ اور کتابت کا حسین اِمتزاج

طباعت کا اعلیٰ ترین معیار

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ○ 25 بی، گلبرگ 2، لاہور
tolueislam@gmail.com ; www.islamicdawn.com
www.facebook.com/tolueislam.trust
Phone: +92 42 35753666

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بَلِّغۡ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡكَ مِنۡ رَّبِّكَ ؕ (5:67)

کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟

مغربی ممالک کے دانشور، وہاں کے مختلف علمی اور فکری اداروں کے ریسرچ سکالرز، یا یونیورسٹیوں کے اساتذہ اور طلباء، اسلام کے متعلق جب کبھی کچھ دریافت کرنے کے لیے آتے رہتے ہیں آخر میں وہ ایک سوال ضرور کرتے ہیں اور وہ یہ کہ اگر اسلام ایسا ہی انسانیت ساز اور منفعت بخش نظام حیات تھا تو وہ تھوڑا سا عرصہ قائم رہنے کے بعد ناکام کیوں ہو گیا۔ وہ آگے کیوں نہ چلا؟ اب میں دیکھ رہا ہوں کہ یہی خیال ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ میں بھی عام ہو رہا ہے، اور میرا اندازہ یہ ہے کہ اسے ایک خاص مقصد کے تحت منظّم طور پر پھیلایا جا رہا ہے۔ مغربی مفکر اپنے خیال کا اظہار کچھ نرم انداز سے کرتے ہیں لیکن ہمارے یہ نوجوان بڑی جرأت و بیباکی سے کہہ دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اسلام نے تاریخ کے ایک خاص دور میں اس قسم کے درخشندہ نتائج پیدا کر دیئے تھے۔ لیکن اس کے بعد زمانہ آگے بڑھ گیا، حالات بدل گئے۔ اب اس میں اس کی صلاحیت نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکے، اب اس کی حیثیت ایک چلے ہوئے کارتوس سے زیادہ کچھ نہیں۔ لہٰذا ہمیں اس خوش فہمی سے نکل جانا چاہئے کہ ہم اسلام کو ساتھ رکھتے ہوئے زندہ رہ سکتے اور ترقی کر سکتے ہیں۔ یہ ہیں وہ خیالات جن کا اظہار ہمارے نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کی طرف سے بہ شدومد کیا جاتا ہے۔ میں اپنے ان نونہالان ملت کے اس قسم کے خیالات پر نہ ناک بھویں چڑھایا کرتا ہوں، نہ ہی انہیں لاحول پڑھ کر دھتکارا کرتا ہوں۔ میں ان حالات کا جائزہ لیا کرتا ہوں جن کی بنا پر ان کا دل اس قسم کے وساوس کی آماجگاہ اور ان کا دماغ اس قسم کے شکوک کا مسکن بنا دیا جاتا ہے اور کوشش کیا کرتا ہوں کہ حقائق و بصائر کی رو سے انہیں اصل حقیقت سے آگاہ کروں اور دلائل و براہین کی بنیادوں پر ان کے شکوک و شبہات دور کروں۔ اس میں مجھے اکثر کامیابی ہوئی ہے۔ آج کی نشست میں اس خطاب سے بھی میرا مقصود یہی ہے۔ اسی بنا پر میں نے اس کا عنوان بھی انہی نوجوانوں کے الفاظ سے مستعار لے لیا ہے۔

اسلام کسے کہتے ہیں؟

سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہئے کہ اسلام کہتے کسے ہیں؟ اس کائنات میں خدا کے متعین کردہ، غیر متبدل، اٹل قوانین کارفرما ہیں جن کے مطابق یہ کارگہ عظیم اس حسن و خوبی کے ساتھ سرگرم عمل ہے۔ عام اصطلاح میں انہیں قوانین فطرت

کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قوانین کروڑ ھا کروڑ سالوں سے اسی طرح کارفرما چلے آ رہے ہیں۔ نہ یہ آج تک ناکام ثابت ہوئے ہیں، نہ تھک کر کسی مقام پر رک گئے ہیں۔ نہ ہی ان کے نتائج و اثمار میں کسی قسم کا نقص یا خلفشار رونما ہوا ہے۔ مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط (67:3) تم تخلیق خداوندی میں کہیں کوئی خلل نہیں پاؤ گے۔

جس طرح خدا نے خارجی کائنات کے لیے اٹل قوانین متعین کیے ہیں، اسی طرح اس نے انسانی دنیا کے لیے بھی ایسے محکم اصول اور مستقل اقدار مقرر کئے ہیں جن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے افراد اور اقوام کو زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں حاصل ہوتی ہیں اور انسانی معاشرہ سکون و اطمینان کا گہوارہ اور عروج و ارتقاء کا طیارہ بن جاتا ہے۔

انسانی دنیا:

لیکن اشیائے کائنات اور انسانی دنیا میں ایک بنیادی فرق ہے۔ اشیائے کائنات ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لئے مجبور پیدا کی گئی ہیں۔ انہیں ان کی خلاف ورزی کا اختیار ہی نہیں۔ لیکن انسان کو صاحب ارادہ پیدا کیا گیا ہے۔ لہٰذا اسے اس کا اختیار ہے کہ جی چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور جی چاہے ان سے سرکشی اختیار کر لے۔ جب کوئی قوم ان کے مطابق زندگی بسر کرے گی تو وہ زندگی کی خوشگواریوں سے بہرہ یاب ہوگی۔ جب وہ انہیں چھوڑ دے گی تو ذلتوں اور پستیوں کے جہنم میں جا گرے گی۔ اگرچہ بات بالکل واضح ہے لیکن میں دو ایک مثالوں سے اس کی مزید وضاحت کرنا ضروری سمجھتا ہوں تا کہ یہ دل کی گہرائیوں میں اتر جائے۔ ایک مریض کسی ڈاکٹر سے علاج کراتا ہے اور اس کے نسخے سے اسے آرام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ کچھ عرصہ کے بعد وہ اس نسخہ کا استعمال چھوڑ دیتا ہے اور پھر بیمار ہو جاتا ہے۔ فرمائیے! اس سے کیا آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ وہ نسخہ ناکام رہ گیا یا یہ کہیں گے اس مریض نے اس نسخہ کو چھوڑ کر مرض کو پھر بلا لیا؟

یا (مثلاً) ایک شخص کسی خاص مقام تک جانے کے لیے موٹر میں سوار ہوا۔ راستے میں اس نے موٹر کو ایک طرف کھڑا کیا اور خود ریسٹ ہاؤس میں جا کر سو گیا اور یوں اپنی منزل مقصود پر پہنچ نہ سکا۔ کہئے! آپ اس کے متعلق یہ کہیں گے کہ اس موٹر میں اس کی صلاحیت ہی نہیں تھی کہ وہ اگلا راستہ طے کر سکتی یا اس مسافر کی تن آسانی کا ماتم کریں گے!

یا (مثلاً) ایک شخص چھت پر جانے کے لیے سیڑھیوں پر چڑھا۔ لیکن نصف سیڑھیوں پر پہنچ کر پہلے بیٹھ گیا اور پھر نیچے اتر آیا۔ فرمائیے! آپ اس پر یہ محاکمہ کریں گے کہ اس مکان کی سیڑھیاں بڑی ناقص ہیں جو کسی کو چھت تک لے جا نہیں سکتیں، یا اس شخص کی دوں ہمتی کو الزام دیں گے؟

یا (مثلاً) ہمارے ہاں بائیں چلو (Keep to the Left) ٹریفک کا قانون ہے۔ گذشتہ ماہ تک ہمارا معاشرہ اس قانون کے مطابق چلتا رہا تو ٹریفک کا کوئی حادثہ نہ ہوا۔ یکم نومبر سے ہر راہ رو یہ کہہ کر گھر سے نکلا کہ میں اس قانون کی پابندی نہیں کروں گا۔ اس کا نتیجہ جو کچھ ہوا اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ فرمائیے! کیا آپ اس سے یہ نتیجہ مرتب

کریں گے کہ اکتوبر کے آخر تک تو اس قانون میں ٹریفک کے حادثات روکنے کی صلاحیت تھی۔ لیکن اس کے بعد اس میں اس کی صلاحیت نہیں رہی۔ یہ بالکل بیکار ہو گیا ہے! یہ اس قابل تھا ہی نہیں کہ بڑھتی ہوئی ٹریفک کا ساتھ دے سکے۔

ان مثالوں کے بعد عزیزان من! پھر اصل موضوع کی طرف آجایئے۔ اسلام نے زندگی کے کچھ اصول وقوانین دیئے۔ ایک قوم نے ان کے مطابق اپنا معاشرہ متشکل کیا۔ اس سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کی درخشندگی اور تابناکی سے آج بھی تاریخ کے اوراق جگمگا رہے ہیں۔ مجھے اس باب میں کچھ زیادہ کہنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ اس سے وہ لوگ بھی انکار نہیں کرتے جو یہ اعتراض کرتے ہیں کہ اسلام آگے نہیں چل سکا۔ اس حد تک تو وہ بھی معترف ہیں کہ اسلام نے اس زمانے میں نہایت شاداب نتائج پیدا کیے تھے۔ ان کا اعتراض یہ ہے کہ اس کے بعد اسلام میں یہ صلاحیت نہیں رہی کہ اس قسم کے نتائج پیدا کرتا چلا جائے۔ ہم نے دیکھنا یہ ہے کہ:

(1) کیا ایسا ہوا تھا کہ وہ قوم ان قوانین پر بدستور عمل پیرا رہی، لیکن اس کے باوجود وہ ان ثمر بار نتائج سے محروم ہو گئی جن سے وہ پہلے بہرہ یاب ہوئی تھی، یا اس نے ان قوانین کا اتباع چھوڑ دیا تھا جس کی وجہ سے وہ ان نتائج سے محروم ہو گئی۔

(2) اگر واقعہ یہ ہو کہ وہ قوم ان قوانین کے مطابق بدستور زندگی بسر کرتی رہی۔ لیکن اس کے باوجود عروج واقبال سے محروم ہو گئی تو پھر یہ سمجھنا درست ہو گا کہ ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہی نہ تھی کہ وہ آگے چل سکتے۔ لیکن اگر واقعہ اس کے خلاف ہو، یعنی حقیقت یہ ہو کہ اس قوم نے ان قوانین کی پابندی چھوڑ دی تھی تو پھر یہ دیکھنا ہو گا کہ کیا ان قوانین میں اس کی صلاحیت ہے کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکیں اور اگر ان پر آج بھی عمل پیرا ہوا جائے تو اس سے وہی نتائج مرتب ہو سکیں جو اس زمانے میں ہوئے تھے۔ آیئے! ان سوالات پر حقیقت پسندانہ انداز سے غور کریں اور جذبات سے الگ ہٹ کر دیکھیں کہ تاریخی شواہد اور واقعات عالم کا مطالعہ ہمیں کس نتیجہ پر پہنچاتا ہے۔

انہوں نے اسلام کو چھوڑ دیا:

پہلے ہم اس سوال کو لیتے ہیں کہ کیا اس قوم نے اسلام کے اصولوں کا اتباع بدستور جاری رکھا تھا یا انہیں چھوڑ دیا تھا؟ اس سلسلہ میں، میں اس مقام پر صرف چند ایک اصولوں کا ذکر کروں گا، اور وہ بھی اجمالاً۔ ان کا تفصیلی تذکرہ اگلے سوال کے جواب میں سامنے آئے گا۔

1۔ ملوکیت:

اسلام نے اصول یہ دیا تھا کہ کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں سے اپنے احکام کی اطاعت کرائے۔ حکومت کا فریضہ، قوانین خداوندی کا نافذ کرنا ہے جن کا اطلاق مملکت کے تمام افراد پر یکساں ہو گا۔ حتیٰ کہ ان سے سربراہ مملکت بھی مستثنیٰ نہیں ہو گا۔ امت کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہوں گے اور معاشرہ میں عزت وتکریم کا معیار، جوہر ذاتی اور سیرت وکردار کی بلندی ہو گا، نہ کہ موروثی اور خاندانی وجاہت وثروت۔ اس اصول نے ملوکیت کی جڑ کاٹ کر رکھ

دی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ افرادِ معاشرہ کو وہ حقیقی آزادی حاصل ہوگئی جس سے ان کی مضمر صلاحیتیں ابھر آئیں۔اس قوم نے اپنی ہمعصر اقوام میں جو اس قدر بلند امتیازی مقام حاصل کرلیا تھا، اس کا بنیادی سبب یہی تھا۔

کچھ عرصہ کے بعد انہوں نے اسلام کے اس بنیادی اصول سے انحراف برت کر اپنے ہاں ملوکیت کا نظام قائم کرلیا اور اس کا نتیجہ وہی ہوا جو استبداد ملوکیت کے تحت ہوا کرتا ہے۔یعنی شرف انسانیت کی تذلیل۔

2۔ برہمنیت:

اسلام نے یہ اصول دیا کہ خدا اور بندے کے درمیان کوئی حاجب و دربان نہیں۔ ہر شخص بلا کسی درمیانی واسطہ کے براہ راست قوانین خداوندی کی اطاعت کرسکتا ہے۔اس سے مذہبی پیشوائیت کا خاتمہ ہوگیا اور یوں اس استبداد کی زنجیریں کٹ گئیں جس نے انسانیت کے قلب اور دماغ کو اپنی گرفت میں لے رکھا تھا۔اس آزادی سے انسان کو حریت فکر ونظر نصیب ہوئی اور وہ تمام رکاوٹیں دور ہوگئیں جو علمی تحقیق اور فکری کاوش کے راستے میں بری طرح حائل تھیں۔ نتیجہ یہ کہ وہ قوم چند دنوں میں علم وبصیرت کی فضائے بسیط میں بے محابا پرواز کے قابل ہوگئی۔اس کے بعد اس قوم نے اس اصول سے سرکشی برتی اور اپنے ہاں پھر سے برہمنیت (مذہبی پیشوائیت) کو رائج کرلیا۔یہ وہ عذاب ہے جس میں یہ قوم اب تک ماخوذ چلی آرہی ہے۔

3۔سرمایہ داری:

اسلام نے یہ اصول دیا کہ یہ چیز وجہ ذلت انسانیت ہے کہ کوئی شخص روٹی کے لیے کسی دوسرے شخص کا محتاج ہو۔ نظام مملکت کا فریضہ ہے کہ وہ تمام افرادِ معاشرہ کی بنیادی ضروریات زندگی کی ذمہ داری لے۔اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہوگا کہ ذرائع پیداوار افراد کی ملکیت کی بجائے مملکت کی تحویل میں رہیں اور فاضلہ دولت کسی شخص کے پاس نہ رہے۔اس سے جہاں تک تمام افراد قوم رزق کی پریشانیوں سے محفوظ ہوگئے، وہاں معاشرہ ہوس زراندوزی کی لعنت سے بھی پاک ہوگیا۔اس قسم کے نظام میں عروج وارتقاء کی راہیں جس برق رفتاری سے کشادہ ہوجاتی ہیں، اس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے۔لیکن کچھ عرصہ کے بعد جب اس قوم نے ملوکیت کو اپنے ہاں پھر سے رائج کرلیا۔تو نظام سرمایہ داری کی لعنت بھی ساتھ ہی آگئی۔حقیقت یہ ہے کہ ملوکیت مذہبی پیشوائیت اور سرمایہ داری، ایک ہی شجرۃ الزقوم کے برگ وبار ہیں۔ جب یہ قوم اسلامی اصولوں پر کاربند تھی تو حالت یہ تھی کہ بائیس لاکھ مربع میل پر پھیلی ہوئی سلطنت کے سربراہ (عمر فاروقؓ) کے تہبند پر دس، دس، بارہ، بارہ پیوند لگے ہوتے تھے۔لیکن جب ان میں ملوکیت بار پاگئی تو کیفیت یہ تھی کہ اموی خلیفہ، ہشام بن عبدالملک جب (سیر وتفریح کے لیے نہیں) حج کے لیے چلا ہے تو چھ سو اونٹوں پر صرف اس کے پہننے کے کپڑے لدے ہوئے تھے۔کیا اس کے بعد بھی یہ تحقیق کرنے کی ضرورت ہوگی کہ اس قوم نے اسلامی اصولوں کو چھوڑ دیا تھا یا باقی رکھا تھا!

4: تکریم انسانیت:

اسلام نے یہ اصول دیا تھا کہ پیدائش کے اعتبار سے تمام انسان، صرف انسان ہونے کی جہت سے، یکساں واجب التکریم ہیں۔ اس ایک اصول نے نسلی اور خاندانی تفاوت وامتیازات کی ساری عمارت منہدم کر کے رکھ دی اور وہ خطہ ارض، مساوات انسانیہ کے نور سے جگمگا اٹھا۔ اس معاشرہ میں حبش کا ایک غلام (بلالؓ) سرداران قریش سے زیادہ واجب التعظیم قرار پا گیا کہ سیرت وکردار کی رو سے وہ ان سے ممتاز تھا۔ اور امیر المومنین (حضرت عمرؓ) کے جنازہ کی نماز پڑھانے کے لیے روم کے ایک مزدور (صہیبؓ) کو منتخب کیا گیا۔

نسلی امتیازات اور گروہ بندانہ تفریقات کے مٹنے کا ایک نتیجہ یہ بھی تھا کہ امت میں وحدت پیدا ہوگئی۔ یہ وہی چٹان تھی جس سے ٹکرا کر مخالفت کی ہر قوت پاش پاش ہوجاتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہوں نے پھر نسلی امتیازات کو بیدار کر لیا جس کا پہلا نتیجہ یہ ہوا کہ امت کی وحدت پارہ پارہ ہوگئی۔ کیا آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ خلافت راشدہ تک تو سلطنت امت مسلمہ کی تھی۔ لیکن اس کے بعد مختلف خاندانوں کی حکومتیں قائم ہوئیں۔ امت کی حکومت کہیں قائم نہیں ہوئی۔ یہ حکومتیں بنوامیہ، بنوعباس، بنوفاطمہ کی تھیں۔ اور یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔

5۔ غلامی:

تکریم انسانیت کا فطری نتیجہ غلامی کا ختم کر دینا ہے۔ ظہور اسلام کے وقت جو غلام اور لونڈیاں عرب معاشرہ میں موجود تھے، قرآن نے انہیں رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا اور آئندہ کے لیے اس لعنت کو ختم کر دیا۔ معاشرہ میں جذب کردہ غلاموں کو مقام کیا دیا گیا تھا، اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ جب حضرت عمرؓ سے، ان کی شہادت کے وقت کہا گیا کہ اپنے جانشین کے بارے میں آپ اپنی رائے دے دیں تو آپ نے کہا کہ اگر ابی حذیفہؓ کا آزاد کردہ غلام، سالمؓ موجود ہوتا تو میں خلافت کے لیے اس کا نام تجویز کرتا۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد، اس قوم نے شرف انسانیت کے اس اصول کو ترک کر دیا اور اپنے ہاں غلامی کو پھر رائج کر لیا۔ نتیجہ یہ کہ خلفاء کے حرموں میں ہزاروں کی تعداد میں لونڈیاں ہوتی تھیں اور بغداد میں ان کی خرید وفروخت کے لیے ایک بازار مخصوص تھا۔ جہاں حکومت کی زیر نگرانی انسانیت بکتی تھی۔

میں سمجھتا ہوں کہ یہ بتانے کے لیے کہ اس قوم نے اسلام کے اصولوں کو چھوڑ کر پھر سابقہ روش اختیار کر لی تھی۔ اتنی مثالیں ہی کافی ہوں گی۔ بنابریں، آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ اسلام نے کچھ وقت کے لیے خوشگوار نتائج مرتب کئے تھے لیکن اس کے بعد اس میں ایسا کرنے کی صلاحیت نہیں رہ گئی تھی۔

کیا اسلام میں اب بھی اس کی صلاحیت ہے؟

اس کے بعد عزیزان من! ہم اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ کیا اسلام میں اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت ہے؟ اور اس سوال کے جواب میں، میں یہ کہوں گا کہ ''اب بھی آگے چلنے کی صلاحیت'' تو ایک طرف، اس چودہ سو سال میں دنیا میں چلا

ہی اسلام ہے۔کوئی دوسرا نظام چلنے کے قابل ثابت ہی نہیں ہوا۔میرا یہ جواب بڑا تعجب انگیز نظر آئے گا لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حقیقت پر مبنی ہے، محض جذباتی نعرہ نہیں۔اس کے لیے پہلے ایک تمہیدی وضاحت ضروری ہے۔

قرآن کریم میں ہے کہ جو ابدی اصول اور مستقل اقدار، انسانی راہ نمائی کے لیے منجانب اللہ عطا ہوئے ہیں، ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ، راستے کے موانعات کو ہٹاتے ہوئے، آگے بڑھیں اور اپنی منزل مقصود تک پہنچ جائیں۔سورۃ فاطر میں ہے: اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10)۔ان نظریات حیات میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اوپر کو ابھرتے ہوئے، عروج وارتقا کی اس منزل تک پہنچ جائیں جسے ان کے لیے متعین کیا گیا ہے۔ان نظریات کو قرآن نے الحق کہہ کر پکارا ہے اور ان موانعات کو جو ان کا راستہ روک کر کھڑے ہوجاتے ہیں وہ باطل سے تعبیر کرتا ہے اور اس کشمکشِ حق و باطل کے متعلق کہتا ہے کہ: بَلۡ نَقۡذِفُ بِالۡحَقِّ عَلَی الۡبَاطِلِ فَیَدۡمَغُہٗ فَاِذَا ہُوَ زَاہِقٌ ؕ (21:18) الحق، باطل پر اپنا نشانہ لگاتا رہتا ہے تا آنکہ باطل کا بھیجا نکل جاتا ہے۔اور یوں وہ میدان چھوڑ کر بھاگ نکلتا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن کہتا ہے کہ اس طرح باطل کی شکست اور حق کی فتح۔۔۔ یا یوں کہئے کہ ان نظریات حیات کی اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کی رفتار بڑی سست ہوتی ہے۔

کائناتی رفتار:

یَعۡرُجُ اِلَیۡہِ فِیۡ یَوۡمٍ کَانَ مِقۡدَارُہٗۤ اَلۡفَ سَنَۃٍ مِّمَّا تَعُدُّوۡنَ (32:5) ان کی اس رفتار کا ایک ایک دن، تمہارے حساب وشمار کی رو سے ایک ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔اگر آپ ان نظریات کو اپنی زندگی میں عملاً رائج کرلیں۔تو پھر ان کے نتائج، انسانی حساب وشمار کے مطابق دنوں میں مرتب ہوجاتے ہیں۔چنانچہ جہاں اس نے کہا ہے کہ: اِلَیۡہِ یَصۡعَدُ الۡکَلِمُ الطَّیِّبُ (35:10) (ان نظریات میں از خود ابھرنے کی صلاحیت موجود ہے) اس کے بعد کہا ہے کہ: وَالۡعَمَلُ الصَّالِحُ یَرۡفَعُہٗ ؕ (35:10) انسانی اعمال صالح کی قوت انہیں نہایت تیزی سے اوپر اٹھا دیتی ہے۔یہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔

عقل کا تجرباتی طریق:

تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ انسان اپنی عقل وفکر اور تجربہ ومشاہدہ کی رو سے مسائل حیات کے حل کرنے کی کوشش میں لگا چلا آرہا ہے۔غاروں کے زمانے سے لے کر اس دور تہذیب وتمدن تک کی تاریخ اس کی انہی کوششوں کی مسلسل داستان ہے۔لیکن یہ ظاہر ہے کہ عقل کا طریق تجرباتی ہوتا ہے۔وہ (Trial and error) کے طریق سے معاملات کو سمجھتی اور سلجھاتی ہے۔وہ ایک نظریہ وضع کرتی ہے۔اس پر عمل پیرا ہوتی ہے۔سینکڑوں برس کی لامتناہی خارہ شگافیوں کے بعد، یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ نظریہ غلط تھا۔وہ اسے چھوڑ کر پھر کوئی اور نظریہ وضع کرتی ہے اور اسی طریق پر، اس کا تجربہ کرنا شروع کردیتی ہے۔اس طرح صدیوں کے پیہم ناکام تجارب کے بعد، وہ کسی صحیح نظریہ تک پہنچتی ہے۔عقل کے اس تجرباتی طریق کی رو سے، ایک صحیح نظریہ تک پہنچنے کے لیے جہاں انسان کو ہزاروں سال کی مسافت طے کرنی پڑتی ہے۔وہاں آگ اور خون کی سینکڑوں خندقیں

بھی پھاندنی پڑتی ہیں۔اس کے برعکس وحی خداوندی انسان کو پہلے دن ہی صحیح نظریات حیات عطا کر دیتی ہے۔ان نظریات کی صداقت کو(علی وجہ البصیرت) تسلیم کر کے، ان کے مطابق عمل پیرا ہوجانے والی جماعت، ان راستوں کو، جنہیں تنہا عقل انسانی نے قرن ہا قرن میں طے کیا تھا، اور وہ بھی اس قدر جانکاہ مشقتوں کے بعد، چند دنوں میں، نہایت امن وسکون کے ساتھ، طے کر جاتی ہے۔اس طرح ان نظریات کے وہ نتائج، جو عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے، ہزار ہا سال میں جا کر برآمد ہونے تھے، چند دنوں میں ظہور پذیر ہوجاتے ہیں۔اس سے ظاہر ہے کہ انسانی علم وعقل بھی، رفتہ رفتہ، ان صحیح نظریات تک پہنچ جاتی ہے جنہیں وحی نے عطا کیا تھا۔لیکن اس فرق کے ساتھ کہ عقل کی راہیں بڑی طول طویل اور پر از خطرات وصعوبات ہوتی ہیں اور وحی کی روشنی میں یہ راستہ طرفتہ العین میں طے ہو جاتا ہے اور نہایت امن وسلامتی کے ساتھ۔ افلاطون(Plato) نے ہزاروں سال پہلے اس حقیقت کو پالیا تھا جب اس نے کہا تھا کہ:

یہ(ارباب فکر) کچھ بنائیں گے۔اسے پھر مٹائیں گے۔یہی کچھ کرتے رہیں گے۔تا آنکہ وہ انسانی راستوں کو حتیٰ الامکان، خدائی راستوں سے ہم آہنگ کرلیں گے۔(Republic)

اقبالؔ نے اسی حقیقت کو اپنے انداز میں یوں بیان کیا ہے کہ:

ہر دو امیر کارواں، ہر دو بمنزلے رواں عقل بہ حیلہ می برد، عشق برد کشاں کشاں

صدر اوّل میں اسلام:

اس تمہید وضاحت کے بعد، اصل موضوع کی طرف آیئے۔انسان، تنہا عقل کی رو سے، زندگی کے طول طویل راستوں پر گامزن چلا آرہا تھا۔اندھیروں میں ٹامک ٹوئیاں مارتا، ٹھوکریں کھاتا، ہڈیاں تڑواتا۔۔کہ آج سے چودہ سو سال پہلے، قندیل وحی نے ان راستوں کو یک دم روشن کر دیا۔عرب میں بسنے والی قوم نے اس کے عطا کردہ نظریات حیات کو اپنایا اور برق رفتاری سے آگے بڑھ گئی۔اس کے بعد اس قوم نے وحی کی راہ نمائی کو چھوڑ دیا، اور کاروان انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہ حیات پر گامزن ہوگیا۔اب اس کی رفتار پھر سست ہوگئی۔انسانیت پھر عقل کے تجرباتی طریق سے شاہراہ حیات پر گامزن ہوگئی۔اب اس کی رفتار پھر سست ہوگئی۔رفتار تو بے شک سست ہوگئی لیکن اس کا ہر قدم اٹھتا اسی منزل کی طرف جارہا ہے جس طرف اسے وحی کی روشنی لے جارہی تھی۔چنانچہ تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے کہ انسان آج سے چودہ سو سال پہلے، جن غلط نظریات کو سینے سے لگائے ہوئے تھا اب رفتہ رفتہ انہیں چھوڑتا جارہا ہے اور ان نظریات کی طرف آرہا ہے جنہیں قرآن نے عطا کیا تھا۔یہ ہے مطلب میرے اس کہنے کا کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں اسلام ہی آگے چلا ہے۔اسلام کے خلاف نظریات سب ناکام ثابت ہوتے چلے جارہے ہیں۔آیئے، اس کی چند ایک مثالیں سامنے لائیں۔

حق حکومت:

چھٹی صدی عیسوی میں، ساری دنیا میں انداز حکومت ملوکیت تھا۔جس کی رو سے، راجہ کو ایشور کا اوتار، قیصر کو خدائی

اختیارات کا حامل، اور کسری کو زمین پر خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا۔ عین اس ماحول میں قرآن نے آ کر کہا کہ: مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (3:79) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں، خواہ اسے ضابطہ قوانین، حق حکومت اور نبوّت بھی کیوں نہ مل گئی ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم خدا کے نہیں بلکہ میری محکوم بن جاؤ۔ اس ایک اصول کی رو سے قرآن نے، ملوکیت تو ایک طرف، حکومت کی کوئی ایسی شکل باقی نہ رہنے دی جس میں انسان دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔ اب رہا یہ کہ پھر حکومت ہو کس طرح سے؟ اس نے کہا کہ حکومت انسانوں کی نہیں ہوگی بلکہ ان مستقل اقدار اور اصولوں کی ہوگی جو خدا کی طرف سے عطا کیے گئے ہیں۔ ان اصولوں کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے، امت اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق باہمی مشاورت سے اپنے معاملات طے کرے گی۔ (42:38)۔ اس میں مذہبی پیشوائیت کا بھی کوئی دخل نہیں ہوگا اس لیے یہ نظام تھیاکریٹک بھی نہیں ہوگا۔ اس اصول کے مطابق مسلمانوں نے نظام حکومت قائم کیا جس کے انسانیت ساز نتائج وجہ شاداب عالم بن گئے۔ اس کے بعد، اس قوم نے اس اصول کو چھوڑ دیا، اور انسان پھر تنہا عقل کی رو سے، ایک اطمینان بخش نظام حکومت کی تلاش میں چل نکلا۔ اب آپ دیکھئے کہ اس چودہ سو سال کے عرصہ میں انسان کا قدم ملوکیت کی طرف اٹھا ہے، یا یہ اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرتا ہوا، کسی ایسے نظام کی تلاش کرتا رہا ہے جس میں کوئی انسان کسی دوسرے انسان کا محکوم نہ ہو۔ وہ اپنی اس تلاش میں ہزاروں خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کے بعد، اس نظام تک پہنچ پایا ہے جسے جمہوریت کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

مغرب کا جمہوری نظام:

ملوکیت کے مقابلہ میں جمہوری نظام، اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ دنیا نظام جمہوریت سے بھی مطمئن نہیں۔ خود مغرب کے بڑے بڑے مفکرین اور سیاستدان اس نظام کے ہاتھوں نالاں ہیں۔ (مثلاً) فرانسیسی مفکر (Rene guenn) لکھتا ہے۔

> اگر لفظ جمہوریت کی تعریف یہ ہے کہ لوگ اپنی حکومت آپ قائم کرلیں تو یہ ایک ایسی چیز کا بیان ہے جس کا وجود ناممکنات سے ہے۔ جو نہ پہلے کبھی وجود میں آئی ہے اور نہ آج کہیں موجود ہے۔ ایسا کہنا ہی ناقابل یقین ہے کہ ایک ہی قوم بیک وقت حاکم بھی ہو اور محکوم بھی۔۔۔ ہماری موجودہ دنیا میں جو لوگ کسی نہ کسی طرح قوت اور اقتدار حاصل کر لیتے ہیں ان کی سب سے بڑی قابلیت اس میں ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کے دلوں میں یہ عقیدہ قائم کردیں کہ ان پر کوئی حاکم نہیں بلکہ وہ خود اپنے آپ حاکم ہیں۔ عام رائے دہندگی کا اصول اسی فریب دہی کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔ اس اصول کی رو سے سمجھا یہ جاتا ہے کہ قانون اکثریت کی مرضی سے وضع ہوتا ہے اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے کہ اکثریت کی یہ مرضی ایک ایسی شے ہے جسے نہایت آسانی سے ایک خاص رخ پر بھی لگایا جاسکتا ہے اور بدلا بھی جاسکتا ہے۔
>
> (Crisis of the modern world)

اقبالؒ کے الفاظ ہیں ؎

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام — دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری — تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری؟

''اکثریت کے فیصلوں'' کے متعلق ایک اور مفکر، پروفیسر الفریڈ کوبن لکھتا ہے کہ (یہ اصول بنیادی طور پر غلط ہے) اگر کسی غلط بات کو لاکھ آدمی بھی صحیح کہہ دیں تو وہ صحیح نہیں ہوسکتی۔ فیصلہ وہی صحیح ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔ نہ وہ کہ جسے زیادہ لوگ صحیح کہنا شروع کردیں۔

(The crisis of civilisation)

پروفیسر کوبن نے کہا ہے کہ ''فیصلہ وہی صحیح ہوسکتا ہے جو درحقیقت صحیح ہو۔'' سوال یہ ہے کہ اس بات کے پرکھنے کا معیار کیا ہے کہ فلاں فیصلہ درحقیقت صحیح ہے۔ قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ معیار، وہ مستقل اقدار ہیں جو وحی کی رو سے عطا ہوتی ہیں۔ دیکھئے اس باب میں اٹلی کا مشہور مدبر، میزینی کیا کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے۔

اس میں شبہ نہیں کہ عام رائے دہندگی کا اصول بہت اچھی چیز ہے۔ یہی وہ قانونی طریق کار ہے جس سے ایک قوم تباہی کے مسلسل خطرات سے محفوظ رہ کر اپنی حکومت قائم رکھ سکتی ہے لیکن ایک ایسی قوم میں جس میں وحدت عقائد نہ ہو، جمہوریت اس سے زیادہ اور کیا کرسکتی ہے کہ وہ اکثریت کے مفاد کی نمائندگی کرے اور اقلیت کو مغلوب رکھے۔ ہم یا تو خدا کے بندے بن سکتے ہیں یا انسانوں کے۔ وہ ایک انسان ہو (ملوکیت) یا زیادہ انسان (جمہوریت)۔ بات ایک ہی ہے۔ اگر انسانوں کے اوپر کوئی اقتدار اعلیٰ نہ ہو تو پھر کون سی چیز ایسی رہ جاتی ہے جو ہمیں طاقت ور افراد کے تغلب سے محفوظ رکھ سکے۔ اگر ہمارے پاس کوئی ایسا مقدس اور ناقابل تغیر قانون نہ ہو جو انسان کا وضع کردہ نہ ہو۔ تو ہمارے پاس وہ کون سی میزان رہ جاتی ہے جس سے ہم یہ پرکھ سکیں کہ فلاں کام یا فیصلہ عدل پر مبنی ہے یا نہیں۔ خدا کے علاوہ جو بھی حکومت قائم ہو، اس میں نتائج کی حقیقت ایک ہی رہتی ہے، خواہ اس کا نام بونا پارٹ رکھ لیں خواہ انقلاب۔ اگر خدا درمیان میں نہ رہے تو اپنے زمانہ حکومت میں ہر ایک مستبد بن جائے گا۔ یاد رکھیئے کہ جب تک کوئی حکومت خدا کے قوانین کے مطابق نہیں چلتی اس کا کوئی حق مسلم نہیں۔ حکومت تو منشائے خداوندی کی ترویج و تنفیذ کے لیے ہے۔ اگر وہ اپنے اس فریضہ کی سرانجام دہی میں قاصر ہے تو تمہارا حق ہی نہیں فریضہ ہے کہ ایسی حکومت کو بدل ڈالو۔

(Cf griffith - Interpretters man).

ہم سمجھتے ہیں کہ میزینی نے بات دوٹوک الفاظ میں بیان کردی ہے۔ عصر حاضر کی ساری کشمکش یہی ہے۔ میکیاوَلی

اصول سیاست، جس کے سب سے بڑے علمبردار، مارکسی فلسفہ کے مدعی ہیں، یہ کہتے ہیں کہ دنیا میں غیر متبدل اصول یا مستقل اقدار کوئی نہیں۔ انسان اپنے معاملات کے فیصلے آپ کرنے میں اختیار مطلق رکھتا ہے۔ اس کے اس اختیار پر کوئی پابندی نہیں لگائی جاسکتی۔ اس کے برعکس، اسلام نے یہ کہا تھا کہ اگر انسان امن وسلامتی سے ترقی کی راہیں طے کرنا چاہتا ہے تو اس کے لیے ضروری ہوجاتا ہے کہ اپنے فیصلوں کے غلط یا صحیح ہونے کا معیار مستقل اقدار کو قرار دے۔ میزینی نے یہی کہا ہے۔ دیکھئے کہ اس بات میں دیگر مفکرین کیا کہتے ہیں۔ پروفیسر (Brend) عصر حاضر کی بے لگام سیاست کے متعلق لکھتا ہے۔

انسان کی کوئی جماعت ہو، ایک فرد کو، ایک محدود حلقہ کے اندر اور خاص شرائط کے ماتحت ہی جذبات کی آزادی دی جاتی ہے۔ اگر وہ اپنے جذبات کو، اس محدود حلقہ سے باہر اور ان مخصوص شرائط کو توڑ کر بروئے کار لانے کی کوشش کرے تو وہ جماعت اس کی روک تھام کی تدبیر کرتی ہے۔ لیکن آج کوئی ایسا اقتدار اعلیٰ نہیں جو اقوام پر بھی اسی قسم کی پابندی عائد کرسکے۔ اس لیے اقوام کو اپنے جذبات کو بے زمام چھوڑنے کی پوری آزادی حاصل ہے۔ آج اقوام عالم کی حالت بالکل عہد طفولیت کی سی ہے جس میں بچہ ہر اس پابندی کو توڑنے کی کوشش کرتا ہے جو اس کے جذبات کے راستے میں حائل ہو۔

(Foundations of Human confilct)

اسی حقیقت کو اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ ؎

جلال بادشاہی ہو کہ جمہوری تماشا ہو جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

یہاں دین سے مراد یہی مستقل اقدار خداوندی ہیں، نہ کہ مذہبی پیشوائیت کے وضع کردہ رسوم وعقائد۔

جس زمانے میں متحدہ اقوام کا ''حقوق انسانیت کا منشور'' زیر تدوین تھا، اس کے ادارہ (Unesco) نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کرکے دنیا بھر کے مفکرین اور سیاستدانوں کے پاس بھیجا۔ اس ادارہ نے بعد میں، ان مشاہیر کے جوابات کو ایک مجموعہ کی شکل میں شائع کیا تھا جس کا تعارف (Jacques Maritain) نے لکھا تھا۔ اس نے اس تعارف میں کہا تھا کہ:

انسان کے حقوق کو (Definition) کی نہیں بلکہ روزمرہ کی زندگی میں ان کے استعمال کے مسئلہ پر متفق ہونے کے لیے سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ اقدار کے پیمانوں پر متفق ہوا جائے۔ حقوق انسانیت کے احترام کے لیے ضروری ہے کہ لوگوں کے نزدیک انسانی زندگی کا عملی تصور مشترک ہو۔ اسے فلسفہ زندگی کہا جاتا ہے۔

''فلسفہ زندگی''، مستقل اقدار کا دوسرا نام ہے۔ اسی کو اخلاقیات کہا جاتا ہے اور اخلاقیات کے متعلق راشڈل لکھتا ہے کہ:

ان سے مفہوم یہ ہے کہ دنیا میں اقدار کے لیے ایک مطلق معیار ہے جو ہر انسان کے لیے یکساں ہے۔

(The theory of good and evil- VI:II)

مارٹن بوبر کہتا ہے کہ:

مستقل اقدار کے یہ معنی نہیں کہ ہر شخص خود فیصلہ کرے کہ مستقل قدر کیا ہے۔ مستقل اقدار کو عالمگیر ہونا چاہئے۔ جسے ہر شخص تسلیم کرے اور ان کا معترف ہو۔

(Between Man and Man)

یہ اقدار ملتی کہاں سے ہیں، اس کے متعلق غور سے سنئے، اور سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اس کا کہنے والا کوئی ملّا یا پادری نہیں۔ کہنے والا عصر حاضر کا سب سے بڑا سائنٹسٹ آئن سٹائن ہے۔ وہ کہتا ہے۔

یہ اقدار تجربات کے بعد وضع نہیں کی جاسکتیں۔ یہ مقتدر ہستیوں کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتی ہیں۔ ان کی بنیاد عقل انسانی پر نہیں ہوتی۔ لیکن وہ تجربہ کی کسوٹی پر بالکل پوری اترتی ہیں۔ اس لیے کہ صداقت کہتے ہی اسے ہیں جو تجربہ سے درست ثابت ہو۔ (out of my later days)

جس نظام میں ان اقدار کو نظر انداز کر دیا جائے۔ اس کا حشر کیا ہوتا ہے، اس کے متعلق اس عالمگیر شہرت کے حامل دانشور کی زبان سے سنئے جس کے تعارف کی ضرورت نہیں۔ یعنی (The making of humanity) کا مصنف برفا۔ وہ لکھتا ہے۔

انسانی ہیئت اجتماعیہ کا کوئی نظام جس کی بنیاد باطل اصولوں پر ہو کبھی قائم نہیں رہ سکتا خواہ اس باطل نظام کو کیسے تدبر اور دانشمندی سے کیوں نہ چلایا جائے۔ اس کی بنیادی کمزوری، خارجی نظم وضبط اور اِدھر اُدھر کی جزئی مرمت سے کبھی رفع نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس کی اصل باقی ہے، اس کے لیے تباہی مقدر ہے۔

یہی مفکر آگے چل کر لکھتا ہے۔

وہ نظام تہذیب جس میں حق وصداقت کو عادی طور پر نظر انداز کر دیا جاتا ہو، آخر الامر تباہ ہو کر رہتا ہے۔ ناانصافی سے کوئی شخص کیسا ہی کامیاب کیوں نہ ہوتا چلا جائے وہ اجتماعی نظام جس کا وہ جزو ہے اور وہ جماعت جو اس ناانصافی کے ثمرات سے نفع اندوز ہوتی ہے، اس ناانصافی کی وجہ سے انجام کار تباہ ہو جاتی ہے۔

عدل کا مفہوم:

برفا نے یہاں کسی نظام کی کامیابی کے لیے عدل کو بنیادی شرط قرار دیا ہے۔ عدل کا عمومی مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ جو فیصلہ ملک کے مروجہ قانون کے مطابق ہو وہ عدل کہلائے گا۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ٹھیک ہے کہ قانون کے مطابق فیصلے کو عدل کہا جائے گا۔ لیکن جس قانون کے مطابق فیصلہ کیا جائے اگر وہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کے مطابق فیصلہ کو عدل کیسے کہا جائے گا۔ اس لئے اس نے کہا کہ ملک کے قوانین کو الحق کے مطابق ہونا چاہئے۔ یعنی مستقل اقدار خداوندی کے مطابق۔ (7:181) تاکہ جو فیصلے اس قانون کے مطابق کیے جائیں وہ فی الواقعہ مبنی بر عدل کہلا سکیں۔

دیکھئے اس باب میں دور حاضر کا ایک مشہور فلسفہ قانون کا ماہر (Email Brunner) کیا کہتا ہے۔ وہ اپنی کتاب (Justice

and the social order) میں لکھتا ہے۔

جو شخص فی الواقعہ سنجیدگی کے ساتھ کہتا ہے کہ فلاں بات مبنی بر عدل اور فلاں ظلم پر مبنی ہے، وہ درحقیقت کہتا یہ ہے کہ عدل اور ظلم کے ماپنے کا ایک ایسا پیمانہ ہے جو تمام انسانی قوانین، معاہدات، رسوم ورواج سے ماوراء ہے۔ وہ ایک ایسا معیار ہے جس سے تمام انسانی معیار ماپے اور پرکھے جاسکتے ہیں۔ یا تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ عدل کے لیے اس قسم کا مطلق، الوہیاتی معیار موجود ہے۔ ورنہ اس لفظ کا مفہوم انفرادی بن کر رہ جائے گا جو ایک کے نزدیک قابل قبول ہوگا اور دوسرے کے نزدیک ناقابل تسلیم۔ عدل کے لفظ سے مفہوم یا تو خداوندی فیصلہ ہوگا جس کے ساتھ حق مطلق (الحق) ہونے کی تقدیس شامل ہوگی اور یا پھر یہ محض جھوٹے نگوں کی میناکاری اور ملمع سازی ہوگی۔

عزیزان من! میں نے کہا تھا کہ قرآن کریم نے اصول یہ دیا تھا۔

(1) کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس لئے ملوکیت، آمریت وغیرہ سب نظام ہائے حکومت باطل ہیں۔ انسانوں کو اپنے معاملات باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔

(2) لیکن اس مشاورت میں ایک شرط کو ملحوظ رکھنا ضروری ہوگا اور وہ یہ کہ کوئی فیصلہ ان اقدار کے خلاف نہ ہو جو حق مطلق کی حیثیت رکھتی ہیں اور وحی کے ذریعے عطا ہوئی ہیں۔

(3) اس کے بعد، عقل کے تجرباتی طریق نے انسان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ ملوکیت، آمریت وغیرہ نظام غلط ہیں ان کے برعکس، نظام مشاورت صحیح نظام ہے جسے جمہوریت کہا جاتا ہے۔

میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ اس حد تک دنیا میں اسلام کا پیش کردہ اصول آگے چلا ہے یا وہ اصول جو پیچھے سے چلا آرہا تھا اور اسلام نے اسے باطل ٹھہرایا تھا؟

لیکن ہمارے زمانہ تک عقل انسانی ہنوز اسلامی اصول کے ایک حصہ کو اپنا سکی ہے۔ بایں ہمہ، اسلامی اصول کے دوسرے حصہ کی صداقت اور اہمیت دور حاضر کے مفکرین کی نگاہوں کے سامنے آرہی ہے اور وہ اس پر زور دے رہے ہیں کہ اسے بھی اپنایا جائے۔ وہ دن دور نہیں جب انسان اس اصول کو اپنانے پر بھی مجبور ہو جائے گا۔ اس لیے کہ اس نظام زندگی کے حیات سوز اور تباہ کن اثرات جسے عصر حاضر نے مستقل اقدار کو نظر انداز کر کے تعمیر کیا، اس قدر نمایاں طور پر سامنے آرہے ہیں کہ خود وہ قومیں جنہوں نے اس نظام کو متشکل کیا تھا، ان کی وحشت سامانیوں کو دیکھ کر چیخ اٹھی ہیں۔ اس چیخ وپکار کی تفصیل میں جانے کے لیے تو ایک ضخیم کتاب کی ضرورت ہوگی۔ میں اس مقام پر دو ایک اقتباسات پر اکتفا کروں گا۔ کچھ عرصہ پہلے لارڈ اسنل (Snell) نے (The new world) کے نام سے ایک کتاب لکھی تھی۔ وہ اس میں کہتا ہے۔

نوع انسان کی پوری تاریخ میں اس قسم کا دور کبھی دیکھنے میں نہیں آیا۔ اس وقت تہذیب ایک دوراہے پر

کھڑی ہے۔ اور یہاں سے اگر ایک قدم بھی غلط سمت کی طرف مڑ گیا تو وہ اسے برباد بلکہ فنا کر دے گا۔ یوں تو انسان کی طول طویل تاریخ میں بہت سے حوادث آئے ہیں لیکن موجودہ حادثہ نہ صرف ان سے وسعتوں اور پہنائیوں میں بڑا ہے بلکہ یہ ان سب سے زیادہ پیچیدہ اور پریشان کن ہے پہلے حوادث خاص خاص خطوں میں رونما ہوا کرتے تھے اور متعین مسائل سے متعلق ہوتے تھے۔ جنگ ہوتی تھی تو کسی ایک مقصد کے لیے۔۔ وہ لڑائیاں خاندانی وجاہت اور مادی تفوق کے لیے ہوتی تھیں۔ لیکن گذشتہ جنگ (یعنی دوسری جنگ عظیم) کو دیکھئے۔ اس کی ظلمت انسانی قلب کی گہرائیوں میں دکھائی دے گی۔ نسلی افتخار، جذبات تغلب وتسلط اور مملکت کے متعلق غلط فلسفہ۔۔ لہٰذا جو مصیبت ہمارے سامنے ہے اس کے متعلق ہمیں کبھی غلط فہمی نہیں ہونی چاہئے۔ اس سے پہلے منظم شر کی قوتیں کبھی اس قدر زور آور نہیں ہوئی تھیں۔ اب تو ان سے نجات کا راستہ ہی کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ ہر ملک ویرانہ بن رہا ہے اور اس ویرانے پر افلاس، امراض اور اموات کے شیاطین منڈلا رہے ہیں۔۔۔ انسانیت اپنے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبتوں سے کچلی جا رہی ہے، تباہ ہو رہی ہے۔ یہ مصیبتیں نتیجہ ہیں ان میکانکی قوتوں کا جنہیں انسان نے ایجاد تو کر دیا۔ لیکن ان پر قابو پانا نہ سیکھا ہر جگہ ریب وشکوک اور اخلاقی اقدار کی شکست کا اندوہناک احساس، انسانی قلوب کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے۔ زندگی اس بیم ورجا، فتح وشکست، امید ویاس کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ اگر ہم نے اپنی ناتواں زندگیوں کی شکستہ عمارت کو ازسرنو محکم بنیادوں پر ستوار نہ کیا تو ہماری تقدیر بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

حکیم مشرق نے اس سے بہت پہلے کہہ دیا تھا کہ:

خبر ملی ہے خدایانِ بحر وبر سے مجھے فرنگ رہگذرِ سیلِ بے پناہ میں ہے

یہ تو ہے عصر حاضر کی اقدار فراموش دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ، جہاں تک افراد کا تعلق ہے، علمِ تحلیل نفسی کے عظیم محقق ڈاکٹر ینگ نے آج سے بہت پہلے لکھا تھا کہ:

عصر حاضر کا انسان مفلوج انسان ہے۔ اندھے حوادث کے مقابلہ میں خوف سے ہراساں ان وحشیانہ قوتوں کے مقابلہ میں جن پر وہ اپنے دور کی معاشی اور سیاسی تدابیر کے زور پر قابو نہیں پا سکتا۔ یہ تو ہے اس کی خارجی دنیا کی حالت اور اگر وہ اس اندھی دنیا سے، جہاں تعمیر وتخریب کی قوتیں ہر وقت ترازو کے پلڑوں کو اٹھاتی جھکاتی رہتی ہیں، اپنے اندر کی دنیا کی طرف جھانکتا ہے تو وہاں اسے باہر سے زیادہ تاریکیاں دکھائی دیتی ہیں۔ (Modern man in search of soul)

عصر حاضر کے راہ گم کردہ انسان کی یہی وہ قلبی کیفیت ہے جسے اقبالؒ نے ان الفاظ میں بیان کیا تھا کہ:

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا زندگی کی شبِ تاریک سحر کر نہ سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا اپنے افکار کی دنیا میں سفر کر نہ سکا

میں پوچھنا چاہتا ہوں اسلام کو ناکام کہنے والوں سے کہ اقوام دورِ حاضر کی یہ چیخ وپکار، اسلامی نظامِ زندگی کی طرف دعوت دے رہی ہے یا اس سے دور بھاگنے کی تلقین کر رہی؟

نظریہ قومیّت:

اب ایک اور سوال سامنے لائیے۔ انسان نے جب مل جل کر رہنے کی زندگی شروع کی تو اسے لامحالہ کسی ایسی بنیاد کی تلاش ہوئی جس سے افراد مل کر ایک جتھ بن سکیں۔ اس دور میں یہ بنیاد خون کے رشتوں کے سوا اور کونسی ہوسکتی تھی۔ اس سے ایک خاندان کے افراد مل کر ایک جتھہ بن گئے۔ انہیں خاندانوں نے وسعت اختیار کر کے قبائل کی شکل اختیار کر لی اور قبائل وسیع تر ہوکر، نسلی امتیازات کے حلقے بن گئے۔ نزول قرآن کے زمانے میں یہی امتیاز قومیت کا معیار تھا۔ اسلام نے یہ انقلابی آواز اٹھائی کہ قومیت کا یہ معیار غلط ہے۔ اس وقت بھی اس کے نتائج بڑے خطرناک مرتب ہو رہے ہیں لیکن جب انسانی آبادی اور بڑھی اور وسائل رسل ورسائل اور ذرائع مواصلات عام ہوئے تو قوموں کا باہمی تصادم خود نوع انسانی کو تباہ کر دے گا۔ اس نے کہا کہ قومیت کا معیار، خون، رنگ، نسل، زبان کے اشتراک کے بجائے، فکر ونظر کی ہم آہنگی ہونا چاہئے۔ اسی کو آئیڈیالوجی یا ایمان کا اشتراک کہتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس نے یہ بھی کہا کہ اس اشتراک کو کسی خاص خطہ زمین تک محدود نہیں ہونا چاہئے۔ كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَّاحِدَةً (2:213)۔ اسے تمام نوعِ انسان کو محیط ہونا چاہئے۔ بالفاظ دیگر اس نے کہا کہ رنگ، نسل، زبان یا وطن کے اشتراک کی بنا پر مختلف قومیں تشکیل کرنے کے بجائے نظریات زندگی کے اشتراک کی بنا پر عالمگیر انسانیت کی برادری کی تشکیل کرنی چاہئے۔ اس بنیاد پر اس نے ایک اُمت کی تشکیل کی جس نے زندگی کی غلط نظاموں کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس کے بعد اس اُمت نے بھی اس اصول کو فراموش کر دیا اور پھر انہی قدیم معیاروں کے مطابق ٹکڑے ٹکڑے ہوگئی۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ کیا اس کے بعد دنیا، عقل کے تجرباتی طریق کی رو سے اسلام کے پیش کردہ اصول اجتماعیت کی طرف آرہی ہے یا اس کے خلاف جارہی ہے۔ پیدائش کے لحاظ سے انسانی تفریق کی بدترین شکل ہندوستان میں رائج تھی جہاں بھارت سے باہر کے انسانوں کو انسان نہیں بلکہ ملیکش (ناپاک حیوان) سمجھا جاتا تھا اور بھارت کے اندر بسنے والے انسانوں کو چار ورنوں (ذاتوں) ___ برہمن، کھشتری، ویش اور شودر ___ میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ یہ تقسیم امٹ تھی کیوں کہ ان کا عقیدہ تھا کہ یہ برہما کی بنائی ہوئی ہے اور اس لئے ان کے دھرم کا بنیادی حصہ ہے۔ آج وہاں یہ ساری تقسیم آئینی طور پر ختم ہوچکی ہے۔ میں پوچھنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی معاشرہ کی یہ تبدیلی قرآن کے دیئے ہوئے اصولوں کی کامیابی کا ثبوت ہے یا اس کی ناکامی کی دلیل اس سے بھی آگے بڑھیے۔ اس سے پہلی دنیا کی ساری آبادی مختلف نسلوں میں بٹی ہوئی تھی ___ اصولی طور پر، سیاہ، سفید، سرخ اور زرد نسلوں میں۔ اور فروعی طور پر ہر نسل کے اندر سینکڑوں شاخوں میں۔ عصر حاضر کی سائنٹیفک تحقیق نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ نسلوں کی یہ تفریق یکسر غیر فطری ہے۔ کسی نسل کو دوسری نسل پر کوئی تفوق حاصل نہیں۔ اور عملاً ان نسلوں کا امتیاز مٹتا چلا جارہا ہے۔ کہئے کہ دنیا اسلام کے قریب آرہی ہے یا اس سے دور چلی جارہی ہے؟ (جاری ہے)

خواجہ ازہر عباس، فاضل درسِ نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

ریاستِ مدینہ
اس کی اہمیت اور اس کی انتظامی ساخت

قرآن کریم کے یہ دو بنیادی نظریات واصول ہیں کہ نہ تو اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم حاصل کیا جاسکتا ہے اور نہ ہی براہِ راست اس کی اطاعت کی جاسکتی ہے یہ نظریات بنیادی، دائمی اور نا قابلِ تغیر وتبدل ہیں۔ لیکن افسوس، صد افسوس اور صد ہزار افسوس کہ ہماری پیشوائیت نے قرآن کریم کے ان دونوں نظریات سے نہ صرف انحراف کیا بلکہ ان دونوں نظریات کی دھجیاں بکھیر دی۔ ہماری پیشوائیت نے اللہ تعالیٰ سے براہِ راست علم حاصل کرنے کے لئے الہام، القاء، کشف، استخارہ، مبشرات، رویائے صادقہ کو بھی علم حاصل کرنے کے ذرائع قرار دیا اور ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس سے قرآن کریم کی اہمیت کم ہوتی ہے اور عملاً قرآن کریم کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ اسی طرح اطاعت خداوندی کی جگہ انفرادی پرستش کے طریقے کو اختیار کیا گیا۔ نوافل، تہجد، وتر، تہلیل وتسبیح، اعتکاف، وظائف، لمبے لمبے چلے، یہ سب رسوم ادا کئے جانے لگیں۔ اور ان رسومات کو اطاعتِ خداوندی کا درجہ دیا گیا۔ براہِ راست علم حاصل کرنے کی وجہ سے قرآن کریم کی ضرورت باقی نہیں رہی اور انفرادی پرستش کرنے کی وجہ سے قرآنی نظام کی ضرورت جاتی رہی۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ سے ہر طرح سے واسطہ منقطع کرلیا گیا۔ اللہ اللہ خیر صلا۔

تعجب اس بات پر ہے کہ اس انحراف وگمراہی میں عوام کا کوئی کردار نہیں ہے۔ اس کی ذمہ دار صرف ہماری پیشوائیت ہے۔ مزید حیرت اس بات پر ہے کہ مسلمانوں کے تمام فرقوں کی پیشوائیت اسی ایک مقام پر کھڑی ہے۔ امام غزالی اور امام ابن تیمیہ سے لے کر شاہ ولی اللہ خود اور ان کا خانوادہ سب کے سب اس جادہ پر رواں دواں رہے۔ پھر کسی ایک ملک کے علماء کرام بھی اس سے مستثنیٰ نہیں عرب اور عجم سب ان ہی بتان کے پجاری ہیں۔ جو جماعتیں اقامت دین کی داعی اور عملاً اس کے لئے کوشاں بھی ہیں، مصر میں اخوان المسلمین، پاکستان میں جماعت اسلامی سب کے یہی عقائد ہیں۔ ان دونوں جماعتوں کے متعلق یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب آپ نے انفرادی پرستش کے ذریعے اللہ کی اطاعت کرلی۔ تو پھر آپ قرآنی نظام کس وجہ سے قائم کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اس بات پر بھی غور فرمائیں کہ اگر قرآنی نظام قائم بھی ہوجائے تب بھی یہ دونوں جماعتیں اس نظام کی اطاعت کو عبادتِ خداوندی قرار نہیں دیتیں بلکہ اقامت دین کے بعد بھی یہ انفرادی پرستش کو ہی اطاعتِ خداوندی قرار دیتی ہیں۔ قرآن کریم کے ان دو نظریات سے انحراف اصل سبب ہے جس کی وجہ سے خلافت راشدہ کے بعد سے ریاست مدینہ کہیں قائم نہیں ہوسکی۔

ہمارا یہ موجودہ دور اس لحاظ سے بڑا خوش بخت دور ہے کہ اس دور میں تحریکِ طلوعِ اسلام کا آغاز ہوا۔ اس تحریک نے

قرآن کے ان دونوں اصولوں پر اصرار کیا۔ ان میں سے ایک ایک اصول کی تائید کی۔ درجنوں کتابیں ان موضوعات پر تحریر کیں۔ تقریباً 80 سال سے رسالہ طلوعِ اسلام شائع ہو رہا ہے جن میں ان عقائد کی تائید جاری ہے۔ لیکن ہماری پیشوائیت کسی طرح بھی پرستش ترک کرنے کے لئے آمادہ نہیں ہے۔

ریاستِ مدینہ کی اہمیت یہ ہے کہ اس کا قائم کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے (42:13)، غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرنا جرم ہے (6:123) اور جو لوگ غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرتے ہیں ان کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97) جو شخص بھی اسلامی نظام قائم کرنے کی فرضیت اور اس کے وجوب سے انکار کرتا ہے، وہ کافر ہے۔

ہم پاکستان میں ریاستِ مدینہ کے قیام کے متعلق عرض کر رہے ہیں کہ پاکستان میں اس وقت تین مکاتبِ فکر کے لوگ موجود ہیں۔

ایک تو وہ لوگ ہیں جو سیکولر کہلائے جاتے ہیں اور جن کی پاکستان میں اکثریت ہے۔ یہ لوگ اپنے معاملات عقل کے ذریعے طے کرانے کے قائل ہیں۔ یہ لوگ سیاست میں مذہب کی دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے۔ ان کے سامنے مذہب ہے یہ لوگ دین سے آگاہ نہیں۔ مذہب ہمیشہ Irrational ہوتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ مذہب کی سیاست میں دخل اندازی کو پسند نہیں کرتے۔ اگر ان کے سامنے دین ہوتا تو یہ صورت نہ ہوتی۔

(2) دوسرا طبقہ مذہبی لوگوں کا ہے۔ یہ حضرات انفرادی پرستش اور انفرادی اطاعت کے قائل ہیں۔ ہماری پیشوائیت مذہب کی پابند ہے۔ ان کے سامنے دین کا کوئی تصور نہیں۔ ان میں سے جو حضرات اسلامی ریاست کے قائل ہیں وہ بھی صرف شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ شریعت کے نفاذ سے ان کو اقتدار ملتا ہے۔

(3) تیسرا طبقہ وہ ہے جو تحریکِ طلوعِ اسلام کے زیر اثر اسلامی نظام اور ریاست مدینہ کا قائل ہے۔ اس تحریک سے متعلق لوگوں کا منفرد نظریہ یہ ہے کہ جب زندگی نے انسانیت کا پیکر پہنا اور جب یہ انسانی سطح پر پہنچی تو اللہ تعالیٰ نے اس زندگی کو ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کی وجہ سے انسان صاحب اختیار و ارادہ ہو گیا اور وہ خود بھی اپنے ہر عمل کا جواب دہ اور ذمہ دار ہو گیا۔ اس توانائی کی نسبت جب اللہ تعالیٰ کی طرف ہوتی ہے تو یہ روحِ خداوندی کہلاتی ہے اور جب اسی توانائی کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے تو یہ نفس انسانی کہلاتی ہے۔ صلاحیت یہ ایک ہی ہے۔ لیکن نسبتوں کے اختلاف کی وجہ سے اس کے دو نام ہو گئے۔ قرآنِ کریم روحِ خداوندی کا قائل ہے۔ لیکن روحِ انسانی کا منکر ہے۔ روحِ انسانی کی بجائے ذات انسانی کا قائل ہے۔ انسانی زندگی کا مقصد اس نفس انسانی یا ذاتِ انسانی کو اس درجہ نشوونما دینا اور اس کو اس درجہ مضبوط کرنا ہے کہ وہ جسم کی موت کے ساتھ نہ مرے بلکہ وہ جسم کی موت کے بعد زندہ رہ کر اگلے مراحل بھی طے کرتی رہے اور اعلیٰ مراتب بھی حاصل کرتی رہے۔

ہماری پیشوائیت روح اور نفس کے اس فرق کو نہیں سمجھ سکی وہ صرف روح اور روحانیت کی قائل ہے۔ قرآن کریم نے نفس انسانی کی نشوونما کے طریقے خود بتائے ہیں۔ لیکن قرآن کریم جب روح انسانی کا قائل ہی نہیں تو وہ روحانیت حاصل کرنے

کے طریقے کس طرح بتا سکتا تھا۔ روح کی نشوونما کے لئے پرستش کو ذریعہ بنایا گیا جو کونوں، گوشوں، جنگلوں، پہاڑوں میں ہر جگہ ہوسکتی ہے۔ وہ سیکولر حکومتوں میں بھی ہوسکتی ہے۔ انہوں نے ہر وہ طریقہ اختیار کیا جس سے قوم غارت اور برباد ہوتی چلی گئی۔ یہ علماء وصوفیاء ریاستِ مدینہ کے قائل ہی نہیں۔ اس لئے پاکستان میں انہیں ریاست مدینہ قائم کرنے کی ضرورت نہیں۔

پاکستان میں صرف تحریک طلوعِ اسلام وہ تحریک ہے جو ریاست مدینہ کی اقامت کو واجب وفرض سمجھتی ہے۔ قرآن کے نزدیک ریاست مدینہ کا قیام ہر شخص پر واجب ہے (42:13، 3:19، 3:85، 5:3) قرآن کے نزدیک جو شخص ریاستِ مدینہ کے بغیر کسی بھی ریاست میں زندگی بسر کرتا ہے وہ مجرم ہے (6:123)، اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے (4:97) اور اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ نفس انسانی کی نشوونما صرف ریاستِ مدینہ میں ہی ہوسکتی ہے۔ طاغوتی نظام میں اس کی پرورش نہیں ہوسکتی۔

نفس انسانی کی پرورش صرف ان اصولوں کے مطابق ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے قرآن میں بتائے ہیں۔ اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُزَكُّوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۭ بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَاۗءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ۝ (4:49)۔ ان لوگوں کی حالت کو دیکھو جو سمجھتے ہیں کہ ان کا تزکیہ نفس ہو رہا ہے۔ یاد رکھو انسانی ذات کی نشوونما صرف اللہ کے قوانین کے مطابق ہوتی ہے۔ اس کے مطابق جو چاہے اپنی نفس کی نشوونما کرسکتا ہے۔ اس کی کوشش میں ذرہ برابر کمی نہیں ہوگی۔ نفس کی پرورش صرف مستقل اقدار پر عمل کرنے سے ہوتی ہے اور یہ مستقل اقدار صرف ریاستِ مدینہ میں ہی جاری ہوسکتی ہیں۔ ہم صرف سمجھانے کی غرض سے 5 مستقل اقدار کا نہایت مختصر تعارف کراتے ہیں۔ ان اقدار پر عمل کرنے سے نفس انسانی اور معاشرہ دونوں کا تزکیہ ہوتا چلتا ہے۔

(1) احترامِ آدمیت: وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (17:70) ترجمہ: ہم نے سب لوگوں کو واجب الاحترام بنایا ہے۔

(2) عدل: عدل کرنا ہی ایک مستقل قدر ہے اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُ بِالْعَدْلِ (16:90) بیشک اللہ عدل کا حکم دیتا ہے جو شخص عدل کرے گا اس کا نفس Develop ہوگا اور معاشرہ کا بھی تزکیہ ہوگا۔

(3) ہر شخص کو عمل کے مطابق درجہ ومرتبہ دیا جائے گا۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ (6:132) ترجمہ: ہر ایک کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق ہوں گے۔ یعنی نسلی وخاندانی امتیاز کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس طریقے سے نفس اور معاشرہ دونوں کی نشوونما ہوتی ہے۔

(4) کسی کی ذمہ داری دوسرا شخص نہیں اٹھائے گا وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ (6:164) کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کے بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

(5) ریاست مدینہ میں دوسروں کی پرورش سے اپنی پرورش ہوتی ہے الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى (92:18) جو شخص اپنا مال دوسروں پر خرچ کرتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہوتا ہے۔

ہم نے صرف 5 مستقل اقدار کا تعارف کرایا ہے جن پر ہر شخص اس لئے عمل کرتا ہے تاکہ اس کے نفس کا تزکیہ ہو لیکن ان اقدار پر عمل کرنے سے معاشرہ بھی ازخود مزکی ہوتا چلا جاتا ہے۔ ریاستِ مدینہ میں جرائم کا انسداد اس لئے ازخود ہو جاتا ہے کہ ہر شخص جرم سے اجتناب کرتا ہے تاکہ اس مُزکّی کے نفس کو ضعف نہ پہنچے۔ ریاست مدینہ کی یہ وہ خوبی ہے جو کسی بھی سیکولر

حکومت میں ہو ہی نہیں سکتی۔ اس لئے کہ ریاستِ مدینہ کی اساس نفس انسانی پر ہوتی ہے اور نفس انسانی کا تصور سیکولر حکومت میں نہیں ہوتا۔

اس کے علاوہ نفس انسانی کی نشوونما کے لئے ہر شخص کو اپنے میں صفاتِ خداوندی کو پیدا کرنا بھی ضروری ہوتا ہے اس عمل سے انسان کی شخصیت بہترین اور متوازن شخصیت بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رب ہے اور ہر چیز کی ربوبیت کرتا ہے۔ اس لئے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کی ربوبیت کرے۔ اللہ تعالیٰ رحیم، کریم، ستار، غفار، واسع، علیم وخبیر ہے۔ ہر شخص کو ان صفاتِ خداوندی کا حامل ہونا چاہئے۔ ریاستِ مدینہ کی بنیاد بھی ان صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے اور ریاست کا فرض ہے کہ وہ ان صفات پر عمل بھی کرے ہم ان صفات پر ایمان لاتے ہیں۔ لیکن یہ صفات خداوندی یہ تقاضہ کرتی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ ریاستِ مدینہ میں ہمارا یہ ایمان عمل میں منتقل ہوجاتا ہے اور اس ریاست میں ہر جگہ صفاتِ خداوندی پر عمل ہوتا محسوس ہوتا ہے اور ان صفات کی روشنی چاروں طرف پھیلی ہوئی معلوم ہوتی ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ذاتِ باری تعالیٰ اپنی صفات کے ساتھ جلوہ گر ہورہی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں اپنے پیچھے ایسی ریاست چھوڑے جارہا ہوں کہ جس کی راتیں بھی دن کی طرح روشن ہوتی ہیں لیکن وائے برحال ما کہ ہمارے دن بھی راتوں کی طرح تاریک ہیں۔

اس مضمون میں ہمارا اصل موضوع ریاست مدینہ کی عملی حیثیت ترکیبی ہے کہ ریاست مدینہ کی کیا صورت اور ہیئت ہوتی ہے۔ اس لئے ہم نے اس کی فرضیت اور وجوب پر بقدر کفایت ہی گفتگو کی ہے کیونکہ اس بارے میں اس سے پیشتر کافی مضامین تحریر کئے جاچکے ہیں۔

(1) ریاستِ مدینہ کے لئے ایک اہم حکم یہ ہے کہ: اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ اَنْ تُؤَدُّوا الْاَمٰنٰتِ اِلٰٓى اَهْلِهَا ۙ وَاِذَا حَكَمْتُمْ بَيْنَ النَّاسِ اَنْ تَحْكُمُوْا بِالْعَدْلِ ؕ (4:58) ترجمہ: بیشک اللہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے سپرد کرو اور جب تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو تو انصاف کے ساتھ کرو۔ امانت انفرادی نہیں ہوتی ہے۔ اقتدار اور اس کو قائم رکھنا امانتیں ہوتی ہیں۔ کوئی بھی اقتدار کی کرسی اس کے اہل کو دو۔ مشہور درسی اور مستند عربی لغت مصباح اللغات میں امانت کا ترجمہ فریضہ خداوندی تحریر کیا گیا ہے۔ یہ موجودہ نظامِ حکومت جسے جمہوریت کہتے ہیں اس میں جو ووٹ دیا جاتا ہے وہ دوسرں کو اپنا اختیار دینا ہوتا ہے کہ تم میری طرف سے اسمبلی میں یہ بات کرنا۔ پھر سورۂ انفال میں ارشاد ہے يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَخُوْنُوا اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ وَتَخُوْنُوْٓا اَمٰنٰتِكُمْ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (8:27)، اے ایمان والو، اللہ ورسول (اسلامی نظام) سے خیانت نہ کرو اور جو چیزیں تمہارے سپرد کی جائیں ان میں خیانت نہ کرو۔ اپنی Duties میں کوئی کمی نہ کرو۔ من حیث الکل نظام کے خلاف خیانت نہ کرنا۔ جن افراد کے پاس کوئی چیز اقتدار کی یا کوئی اختیارات ہوں، اس امانت کو اس کے اہل کے سپرد کرنا چور، ڈاکو، لٹیرے، Money Laundrer کو کسی قسم کا اختیار نہ دینا۔ ایسے لوگوں کو ایک ووٹ بھی نہ دینا۔ سورۂ النساء کی جس آیت میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اختیارات اس کے اہل کو دینا، اس سے اگلی آیت میں حکم ہے کہ جب

مقدمات کے فیصلے کرنے لگو تو تمام فیصلے عدل کے ساتھ کرنا۔ دونوں احکامات کو ایک دوسرے کی تفسیر کے طور پر ساتھ بیان کیا گیا ہے جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہاں امانت کا مفہوم انفرادی امانت نہیں ہے بلکہ عدل وانصاف کے اختیارات کو امانات کہا گیا ہے۔ عدل کرنے کے متعلق جو قرآن کے احکامات ہیں وہ آگے چل کر آتے ہیں۔

(2) پیدائش کے لحاظ سے تو تمام انسان برابر ہوتے ہیں لیکن ان کے مدارج ان کے اعمال کے مطابق طے کئے جاتے ہیں وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ (46:19)، ہر شخص کے مدارج ومراتب ان کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔ جو شخص بھی زیادہ سے زیادہ اطاعت خداوندی کرے گا وہ سب سے زیادہ واجب الاحترام ہوگا يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۭ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ (49:13) اے لوگو! ہم نے تم سب کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور قبائل وخاندانوں میں اس لئے تقسیم کر دیا ہے تا کہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔ اللہ کے نزدیک تو سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔

(3) ریاست مدینہ کا بنیادی فرض یہ ہے کہ وہ عدل قائم کرے۔ عدل کے متعلق قرآنِ کریم کا جو بنیادی نقطۂ نگاہ ہے اس کو بھی سمجھ لینا ایک ضروری بات ہے۔ دنیا کے عام تصور اور رواج کے مطابق انسانوں کے وضع کردہ قوانین کے مطابق عدالت جو فیصلہ کر دے وہ عدل کہا جاتا ہے۔ لیکن قرآن کریم انسانوں کے وضع کردہ قوانین کو سند نہیں کرتا۔ قرآن کے نزدیک انسان جو بھی قوانین وضع کرتے ہیں وہ کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں سورہ المائدہ میں ارشادِ عالی ہے: وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ۝۴۴ فَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۴۷ (5:44، 5:45، 5:47)، تفہیم القرآن میں تحریر ہے، ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے لئے جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم صادر فرمائے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں، دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر، اپنے یا دوسرے انسان کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اوّلاً اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے ثانیاً اس کا یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے۔ کیونکہ ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہوسکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو اس نے ظلم کیا۔ تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے حکم سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت اس نے بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہے۔ ممکن نہیں کہ جہاں وہ انحراف ہو وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔'' (اقتباس ختم)

قرآنِ کریم کا یہ ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اگر آپ قوانین انسانی کی توضیع اور عدل وانصاف کی تاریخ پر نگاہ ڈالیں گے تو قرآن کا یہ دعویٰ بالکل درست نظر آئے گا۔ آپ گذشتہ تاریخ کا مطالعہ نہ بھی کریں اسی موجودہ دور کی قانون سازی کو ہی زیر

مطالعہ رکھیں تو آپ کو قرآن کا یہ دعویٰ درست معلوم ہوگا۔ آپ U.N.O کی تاریخ کا مطالعہ کریں اس کے بیشتر قوانین عدل کے خلاف ہیں۔ فلسطین، کشمیر، برمی مسلمانوں کے متعلق، عراق پر حملہ، یہ جتنے قوانین ہیں سب غلط اور ظلم پر مبنی ہیں۔ ہمارے ہاں پاکستان میں سب قوانین، امیر اور بااثر لوگوں کے حق میں وضع ہوئے ہیں۔ یہ ایک طویل بحث ہے۔ اور قانون دان حضرات ہی اس پر کچھ کہنے کے حقدار اور مستحق ہیں۔ ہم جیسے Laymen اس پر زیادہ نہیں کہہ سکتے۔

(4) قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ دشمن قوم سے بھی عدل کرو۔ دشمنی کے باوجود عدل کا دامن ہاتھ سے نہ جانے دو وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ؕ اِعْدِلُوْا ۟ هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (5:8) ترجمہ: کسی قوم کی دشمنی بھی تمہیں اس بات پر آمادہ نہ کرے کہ تم اس سے عدل نہ کرو، ہمیشہ عدل کرو کہ یہی تقویٰ کے قریب ہے۔

قرآن کریم کا واضح حکم ہے کہ عدل کرنے میں اپنوں اور غیروں کی کوئی تمیز نہ کرو۔ رشتہ داری کے تعلقات، امیر و غریب کی حیثیت یہاں تک کہ اپنی ذات کا فائدہ بھی عدل میں رکاوٹ نہ بنے، فیصلہ بالکل درست اور حق کے مطابق کرو، خواہ وہ تمہاری اپنی ذات کے خلاف ہی کیوں نہ جا رہا ہو۔ سورہ الانعام میں ارشاد گرامی ہے وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ (6:153) جب کوئی بات کرو، عدل کے مطابق کرو اگرچہ وہ شخص جس کے متعلق تم فیصلہ دے رہے ہو، تمہارا کوئی رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔

عدل کرنے میں گواہی کا بہت بڑا کردار ہوتا ہے بلکہ عدل کا دارومدار اس کا انحصار ہی گواہیوں پر ہوتا ہے۔ اس بارے میں قرآن نے جو اصول دیا ہے اس کی مثال دنیا کے کسی عدالتی نظام میں نہیں پائی جاتی ارشادِ گرامی ہے: يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُوْنُوْا قَوّٰمِيْنَ بِالْقِسْطِ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ وَلَوْ عَلٰٓى اَنْفُسِكُمْ اَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ ۚ اِنْ يَّكُنْ غَنِيًّا اَوْ فَقِيْرًا فَاللّٰهُ اَوْلٰى بِهِمَا ۣ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰٓى اَنْ تَعْدِلُوْا ۚ وَاِنْ تَلْوٗٓا اَوْ تُعْرِضُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴿١٣٥﴾ (4:135) ترجمہ: اے ایمان والو انصاف کے علمبردار اور خدا واسطے کے گواہ بنو۔ اگرچہ تمہارے انصاف اور تمہاری گواہی کی زد تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور رشتہ داروں پر ہی کیوں نہ پڑتی ہو۔ لہٰذا اپنی خواہشِ نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلوتہی برتی تو جان لو کہ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ جب ایک مقدمہ میں دو پارٹیاں ہوتی ہیں اور گواہ کسی ایک پارٹی کی طرف سے پیش ہو۔ تمہارے پیش نظر صرف خدا کی خوشنودی ہونی چاہئے قرآن نے یہ ایک ایسا اصول دیا ہے جو دنیا کے کسی عدالتی نظام میں نہیں ہے۔

قرآن کریم نے بدنی سزائیں تجویز کی ہیں۔ قید یا جرمانہ کی سزا کا اتنا اثر نہیں ہوتا جس قدر بدنی سزا کا ہوتا ہے۔ ہمارے معاشرہ میں کرپشن عام ہے اور اوپر کے طبقے میں 90 فیصدی حکام اور لیڈر اس جرم میں ملوث ہیں۔ ہمارا عام مشاہدہ ہے کہ قید اور جرمانے کی سزا کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ اربوں روپے کی کرپشن اب بھی کر رہے ہیں۔ ان ہی لیڈروں اور وزیروں کو اگر کوڑے لگتے تو ان کی ہمت مزید جرائم کرنے کی نہ ہوتی۔ اور ایک مرتبہ کوڑے کھانے کے بعد دوبارہ ارتکاب

جرائم نہ کرتے۔

(5) سورہ نور میں ارشادِ عالی ہے: وَّلَا تَاْخُذْكُمْ بِهِمَا رَاْفَةٌ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ (24:2) ترجمہ: سزا دینے میں نرمی نہ برتو۔ اس میں ججوں کے متعلق کہا گیا ہے کہ اگر کوئی جج نرم دل ہے تو اُسے سزا کے معاملہ میں نرمی نہ دکھانی چاہئے۔ اس کے نزدیک تو یہ قانون کا معاملہ ہے۔ اگر تم اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہو تو یہ جو تمہارے ذاتی جذبات ہیں وہ اس سزا میں رکاوٹ نہ بننے چاہئیں۔ تم اس چیز پر یقین رکھو کہ یہ احکامات خداوندی ہیں اور ان کے نتائج تمہارے سامنے آکر رہیں گے، خواہ اس دنیا میں اور خواہ آخرت میں۔

(6) ہمارے سیاسی لیڈر الیکشن کے زمانے میں ووٹ حاصل کرنے کے لئے جھوٹے وعدہ کرتے ہیں حالانکہ وہ خوب جانتے ہیں کہ وہ یہ وعدے پورے نہیں کرسکیں گے قرآن کریم کا حکم ہے وَاَوْفُوْا بِالْعَهْدِ ۚ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْـُٔوْلًا (17:34) اپنے وعدوں کو پورا کرو۔ یاد رکھو ان وعدوں کے بارے میں تم سے خدا کے ہاں باز پرس ہوگی۔ ریاست مدینہ اللہ تعالیٰ کے Behalf پر وعدے کرتی ہے اگر وہ اپنا کوئی وعدہ پورا نہیں کرتی تو وہ ریاست اللہ کے ہاں جوابدہ ہے اور اس کے تمام عمال اور کارندے اللہ کو دھوکا دے رہے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر قرآن میں ریاست مدینہ کی طرف سے یہ وعدہ ہے وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین پر کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ پر نہ ہو۔ اللہ کی یہ ذمہ داریاں ریاست مدینہ پوری کرتی تھی۔ اگر اسلامی مملکت میں کوئی شخص بھوکا رہے اور اس کو رزق نہیں ملا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اس مملکت نے اللہ کا وعدہ پورا نہیں کیا اور اس نے اللہ کو دھوکا دیا۔ اسلامی مملکت کے کارندے جب اپنے فرائض پورے کرتے ہیں تو وہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور جب اپنے فرائض سے غفلت برتتے ہیں، اور کسی وجہ سے اپنے فرائض پورے نہیں کرتے، تو یہ اللہ کے گنہگار ہوتے ہیں (8:27)

(7) جھوٹے وعدوں کے علاوہ حکام میں یہ مرض بھی عام ہوتا ہے کہ وہ یہ چاہتے ہیں کہ ان کے ثنا گو، ان کی پارٹی کے ''چمچے'' اور ان کے ''کف گیر'' ان کی تعریف کرتے رہیں قرآن کریم نے حکام کو اس عادت سے منع فرمایا ہے اور ان لوگوں کے متعلق ارشاد فرمایا: وَّيُحِبُّوْنَ اَنْ يُّحْمَدُوْا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوْا (3:188) ترجمہ: وہ چاہتے یہ ہیں کہ لوگ ان کے ان کاموں کی بنا پر ان کی تعریف کریں جو کام ان حکام نے سرانجام ہی نہیں دیئے ہوں۔

(8) ہم جو کچھ احکامات تحریر کرتے چلے آرہے ہیں یہ سب ریاستِ مدینہ کے حکام اور اس ریاست کے کارندوں کے متعلق ہیں۔ ان احکام میں ایک حکم یہ بھی ہے: وَلَا تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوْا بِهَآ اِلَى الْحُكَّامِ لِتَاْكُلُوْا فَرِيْقًا مِّنْ اَمْوَالِ النَّاسِ بِالْاِثْمِ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۸﴾ (2:188) ترجمہ: اور تم لوگ نہ تو آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقہ پر کھاؤ اور نہ حاکموں کے آگے اُن کو اس غرض سے پیش کرو کہ وہ تمہیں دوسروں کے مال کا کوئی حصہ قصداً ظالمانہ طریقے سے کھانے کا موقع دیں۔

فرمایا باطل طریقے سے دوسروں کا مال نہ کھاؤ۔ باطل اس طریقہ کو کہتے ہیں جو عدل وانصاف، معروف اور سچائی کے خلاف ہو۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، رشوت، سود، سٹہ، جُوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آجاتی ہیں جو قرآنِ کریم اور ریاستِ مدینہ کے قوانین کے خلاف ہو۔ فرمایا کہ دوسروں کا مال ہڑپ کرنے کے لئے اپنے مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ اس لئے کہ رشوت صرف حصولِ مال کا ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ اِثْمِ، یعنی گناہ، حق تلفی، غصبِ حقوق کا راستہ اور اس کا ذریعہ ہے وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (2:188) یعنی اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا تمھیں معلوم ہے۔ تمام دنیا کے معروف مذہب میں اس کا گناہ اور حق تلفی ہونا مسلم رہا ہے۔ عقل کے نزدیک بھی اس کا گناہ ہونا ایک بدیہی امر ہے۔

(9) سیکولر حکومتوں میں مستغیث مجرم کے خلاف مدعی ہوتا ہے اور اسی شخص کے خلاف عدالت میں مقدمہ دائر کرتا ہے۔ ریاست مدینہ کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اس ریاست میں مستغیث ریاست کے خلاف مدعی ہوتا ہے کیونکہ ریاستِ مدینہ نے اس سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ وہ اس کی ہر متاع کی حفاظت کی ذمہ دار ہے۔ اگر اس متاع پر کسی نے ہاتھ ڈالا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ریاست مدینہ نے اس کے ساتھ بدعہدی و بے وفائی کی ہے۔ ریاستِ کا فرض ہے کہ وہ مدعی کے نقصان کو پورا کرے۔ اگر کسی کے ہاں چوری ہوئی اور وہ چور مل گیا اور عدالت نے اس کو چند سال کی قید کی سزا دے دی تو اس سے مستغیث کا نقصان پورا نہیں ہوگا۔ ریاست مدینہ کی یہ منفرد خصوصیت ہے کہ اگر چور سے مدعی کا سامان برآمد نہیں ہوتا تو ریاست اپنے پاس سے اس مدعی کا مال مہیا کر کے اس کا نقصان پورا کرے گی۔ جمہوریت میں ریاست عوام کو جوابدہ ہوتی ہے۔ ریاست مدینہ میں ریاست اللہ کو جوابدہ ہوتی ہے۔

(10) ریاست مدینہ کے پیش نظر مجرم کی اصلاح ہے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ (4:111) جو کسی کے خلاف جرم یا زیادتی کرتا ہے وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس نے کسی دوسرے کو نقصان پہنچایا ہے۔ حالانکہ اصل بات یہ ہے کہ اس طرح اس نے اپنی ذات کو نقصان پہنچایا ہوتا ہے۔ اس آیۂ کریمہ میں یہ ارشاد ہے کہ جرم کرنے سے خود مجرم کی ذات کو ایسا نقصان پہنچتا ہے جس کی تلافی کسی باہر کی سزا سے نہیں ہوسکتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مجرم اگر کوئی بااثر شخص ہے اور وہ ریاست کی سزا سے اپنے کو محفوظ کرالیتا ہے۔ تب بھی جو نقصان اس کی ذات کو پہنچ چکا ہے وہ اس سے کسی صورت میں بچ نہیں سکتا۔ چونکہ وہ ہر وقت خدا کے مکافاتِ عمل کے تحت زندگی بسر کرتا ہے اس سے باہر نہیں نکل سکتا۔ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (40:19) وہ قانونِ مکافات نگاہ کی خیانتوں اور دل کے پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔ یہ وہ منفرد تعلیم ہے جو کسی بھی اور ریاست میں نہیں پائی جاسکتی ہے۔

جس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ زہر کھانے والا شخص مرجاتا ہے اور ہمیں یقین ہے کہ زہر مہلک ہے۔ اسی طرح اگر ہمیں یقین ہوجائے کہ جرم کرنے سے، مثلاً حرام کا مال کھانے سے ہماری نفس پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے، تو کوئی شخص حرام مال نہیں کھائے گا اور کوئی جرم نہیں کرے گا۔ اس طرح جرائم کا انسداد خود بخود ہوجاتا ہے۔ ریاست مدینہ میں جو چند جرائم ہوتے بھی ہیں وہ صرف اس لئے ہوتے ہیں کہ جرم کے اثرات کا یقین نہیں ہوتا۔ سیکولر حکومتوں میں چونکہ نفس اور اس پر اثرات مرتب ہونے کا

تصور ہی نہیں ہوتا اس لیے ان حکومتوں میں جرائم کا انسداد نہیں ہوتا۔ خصوصاً جو لوگ بااثر ہوتے ہیں اور جن پر قانون کی گرفت نہیں ہوتی وہ جرائم کے ارتکاب سے اجتناب نہیں کرتے۔

(11) ریاستِ مدینہ میں چونکہ قرآنِ کریم کے احکامات جاری ہوتے ہیں اس لئے قرآن کے فلسفہ جزاء وسزا کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

ہر مسلمان کا اس بات پر یقین ہوتا ہے کہ اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہو رہا ہے اور ان ہی اثرات کے مجموعی نتیجہ کے مطابق، آخرت میں اس کے مقام کا تعین ہوگا۔ مجرم کے جرم کے اثرات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ مجرم کے جرم کا ایک اثر سوسائٹی پر ہوتا ہے۔ عدالت سے جو سزا اس کو ملتی ہے وہ سوسائٹی کے خلاف جرم کا ازالہ کر دیتی ہے۔ لیکن اس کے جرم کا جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوا تھا، اس کا ازالہ اس سزا سے نہیں ہوسکتا۔ اس جرم کے ازالہ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے تو مجرم کو اس جرم کے ارتکاب کی شرمندگی محسوس کرنی ہوگی کہ وہ آئندہ اس جرم کا ارتکاب نہیں کرے گا۔ پھر وہ تعمیری کام اس کثرت سے کرے کہ ان تعمیری کاموں کے اثرات، اس جرم کے اثرات کو Cover کر لیں ارشادِ عالی ہے: اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114) نفس پر پڑے ہوئے اچھے اثرات، نفس کے بُرے اثرات کو زائل کر دیتے ہیں۔ اصل بات تو یہ ہے کہ جس شخص کو بھی نفس پر اثرات مرتب ہونے پر اور مکافاتِ عمل پر ایمان ویقین ہوگا اس سے عمداً کوئی جرم سرزد ہو ہی نہیں سکتا اور یہ صرف ریاست مدینہ کی ہی شان ہے، اور یہ اس کی ہی منفرد خصوصیت ہے۔

(12) ریاست مدینہ کا مرکزی نقطہ اور اس کا محور اپنے شہریوں کی جسمانی پرورش اور انسانی صلاحیتوں کی نشوونما اور ان کی برومندی ہے۔ اس ریاست کا فرض ہے کہ وہ ایسا انتظام کرے جس سے ریاست کے تمام افراد کی بنیادی ضروریات بھی پوری ہوتی جائیں، اور انسانی صلاحیتیں بھی پیدا ہوتی چلی جائیں۔ ''ربوبیت'' کرنا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت عالی ہے۔ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ۝ (1:1) سے قرآن کریم شروع ہوتا ہے۔ خدا کی اس صفت ربوبیت پر صرف ریاستِ مدینہ میں ہی عمل ہوسکتا ہے اس لئے کہ اس بارے میں جو ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے اپنے اوپر لی ہیں ان کی ادائیگی ریاست مدینہ کی معرفت اور اس کے ذریعے سے ہوتی ہے ربوبیت کے اس وعدے کو اللہ تعالیٰ نے واشگاف انداز سے فرمایا: وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِی الْاَرْضِ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ رِزْقُهَا (11:6) زمین میں کوئی متنفس ایسا نہیں جس کے رزق کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ کی ذات پر نہ ہو۔ نیز ارشادِ عالی ہے نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِیَّاهُمْ ۚ (6:151)، ہم تمہیں بھی رزق دیتے ہیں اور تمہاری اولاد کو بھی (17:31)، یہ ریاستِ مدینہ کی خصوصیت خاصہ ہے۔

اس ریاست میں ہر شخص اپنی کمائی میں سے صرف اپنی ضرورت کے مطابق لیتا ہے اور باقی سب دوسروں پر خرچ کر دیتا ہے۔ ارشادِ عالی ہے: وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) اے رسول تجھ سے پوچھتے ہیں کہ ہم دوسروں کی ضروریات کے لئے کیا دیں۔ ان سے کہہ دو جو کچھ تمہارے پاس تمہاری ضرورت سے زیادہ ہے وہ سب دوسروں کو دے دو۔ رسول اللہ ﷺ کو یہ حکم تھا کہ: خُذِ الْعَفْوَ (7:199)، ریاست کے شہریوں کے پاس جو کچھ بھی ضرورت سے

زیادہ ہو وہ اُن سے لے لو۔ اس تمام سسٹم پر مملکت کے ذریعے ہی عمل کیا جا سکتا ہے اور اس میں شہریوں کی اپنی معاونت بھی ہوتی ہے۔ وہ بخوشی اس نظام میں حصہ لیتے ہیں۔ اس بات میں ان پر کوئی جبر نہیں ہوتا۔

(13) سیکولر جمہوری حکومتوں میں صدرِ مملکت کو استثنیٰ (Immensity) حاصل ہوتی ہے۔ اگر کسی ملک کے صدر سے، اس کے دوران صدارت کوئی غلطی یا کوئی جرم سرزد ہو جاتا ہے تو اس کے دورانِ صدارت اس کی کوئی گرفت نہیں ہوتی۔ مدینہ منورہ میں حضور ﷺ نے اسلامی مملکت قائم فرمائی۔ اس مملکت کے صدر خود حضور ﷺ تھے۔ آپ اس مملکت کی انفرادیت ملاحظہ فرمائیں کہ قرآن کریم حضور ﷺ کی ذمہ داریوں کے متعلق کیا کہتا ہے ارشاد عالی ہے: اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ (17:75) اگر تم سے چھوٹی سی لغزش بھی سرزد ہو گئی تو ہم تم کو زندگی اور موت دونوں میں دگنا عذاب چکھائیں گے یہ دگنے عذاب کی دھمکی رسول اللہ ﷺ کے درجے اور مرتبہ کے اعتبار سے تھی۔

جن کے رتبے ہیں سوا ان کو سوا مشکل ہے۔

جس قدر مرتبہ بلند اور ذمہ داریاں زیادہ، اسی اعتبار سے ان کی گرفت بھی زیادہ ہوگی۔

ہمارے ملک میں صدرِ مملکت کو جو استثنیٰ حاصل ہوتی ہے وہ قرآن کے سخت خلاف ہے۔

اسی طرح قرآن کریم کی رُو سے صدرِ مملکت کی بیوی The First Lady کو بھی دوہری سزا دی جاتی ہے ارشادِ عالی ہے يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ (33:30) ترجمہ: اے نبی کی بیویو تم میں سے جو کوئی بے حیائی کا کام کرے گی اس کو دوہرا عذاب دیا جائے گا چونکہ بڑے کی غلطی بھی بڑی ہوتی ہے۔ تم میں سے کسی سے ناپسندیدہ حرکت سرزد ہوئی تو یاد رکھئے کہ عام عورتوں کو جو سزا دی جاتی ہے تمہیں اس سے دگنی سزا دی جائے گی۔ جب حضرت عمر اپنی مملکت میں کوئی قانون جاری کرتے تھے تو پہلے اپنے گھر والوں میں آ کر ان کو فرماتے تھے کہ میں کل یہ قانون جاری کروں گا تم آج سے ہی اس پر عمل شروع کر دو کیونکہ تم عام عورتوں جیسی عورتیں نہیں ہو، تمہاری ذمہ داریاں اور عورتوں سے بہت زیادہ ہیں۔

ریاست مدینہ جیسی ریاست اس زمین پر جنت جیسی ریاست تھی۔ اس کا قائم کرنا مشکل بیشک ہے۔ لیکن ناممکن نہیں۔ جب تک آپ اس کی اطاعت کو عبادت خداوندی قرار نہیں دیں گے، اور پرستش کی رسوم کو ترک نہیں کریں گے، اس وقت تک یہ ریاست قائم نہیں ہو سکتی۔ مسلمان اور خصوصاً ہماری پیشوائیت پرستش کی رسوم کو ترک کرنے کے لئے بالکل تیار نہیں ہیں۔ اس لئے بظاہر اس ریاست کا قائم ہونا مشکل معلوم ہوتا ہے۔

ہماری عمران خان صاحب سے بھی درخواست ہے کہ صدرِ مملکت کو جو رعایات ملی ہیں ان کو بھی اس دستور سے نکال دیں۔

وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ (29:69) جو لوگ ہماری راہ میں کوششیں کرتے رہیں گے ہم بھی ان کے لیے راستے کھولتے چلے جائیں گے۔ کیونکہ وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (22:40) جو اللہ کی مدد کرتا ہے اللہ اس کی مدد کرتا ہے۔ اللہ کی مدد کیا ہے، اللہ کے دین کی مدد ہی اللہ کی مدد ہوتی ہے، بیشک اللہ زبردست اور زوروالا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

(قسط نمبر21)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبۂ پاکستان

قرآن سے ہمیں آزادیِ اختیار وارادہ کے حق میں اور جبریت کے خلاف، دونوں نظریات کے متعلق قرآن کے نظریہ مشیت سے راہنمائی ملتی ہے۔ قرآن سے نظریہ جبریت کے حق میں اُس کا نظریہ مشیت مذہبی حلقوں کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے، جس کو ابھی ہم نے واضح کرتے ہوئے اُس کی تردید بھی کی ہے۔ اب ہم یہاں مقالہ میں پہلے قرآن سے نظریہ مشیتِ الٰہی سے نظریہ جبریت کی تردید اور اس کے آزادی اختیار وارادہ کے نظریہ کو مزید واضح کرنے کی کوشش کریں گے۔

مسئلہ جبر وقدر کا حل قرآن کی مشیتِ اللہ کی اصطلاح کی وضاحت میں:

مشیت کے عربی زبان میں مادہ (Root) ہے ''ش ی أ''۔ ہمارے ہاں عام طور پر اس کا ترجمہ ''چاہنا'' یعنی ارادہ کرنا کیا جاتا ہے، جو کہ مشیت کا ایک غیر واضح مفہوم ہے۔ جس سے مسئلہ تقدیر بہت سی غلط فہمیوں کا موجب بن گیا ہے۔ ارادہ تو فقط کسی بات کے چاہنے کو کہتے ہیں اور جب اس ارادہ کے مطابق وہ بات وجود میں آجائے تو اسے مشیت کہا جاتا ہے۔ اس لیے شئ کسی ارادہ کی وجود پذیر شکل کا نام ہے۔

مشیت جب اللہ سے منسوب کی جائے تو قرآن میں اِس کی وضاحت میں ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے تخلیقی پروگرام کے دو حصے ہیں۔

1۔ ایک عالم امر/مشیت

2۔ اور دوسرا عالم خلق۔

عالمِ خلق میں ہمارا مشاہدہ ہے کہ اس دنیا کی ہر شے علت ومعلول (cause and effect) کے سلسلہ میں جکڑی ہوئی ہے۔

دنیا میں ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ کوئی چیز بھی یہاں اتفاقیہ نہیں ہوتی۔ اگر آپ کو کوئی سبب معلوم نہیں تو یوں کہیں کہ میں اس کا سبب معلوم نہیں کر سکا۔ خدا نے طبیعی واخلاقی قوانین بنائے اور بنانے کے بعد وہ خود بھی ان کے اندر مداخلت نہیں کرتا، اس لئے یہ قوانین غیر متبدّل کہلاتے ہیں جو اپنے نتیجے کے اعتبار سے بھی اٹل ہیں۔ خدا نے خود کہا ہے کہ طبیعی کائنات میں سبب

کے بغیر کچھ بھی نہیں ہوسکتا۔ جس چیز کا سبب معلوم نہ ہو سکے اس کو معجزہ سمجھنے کی بجائے کہنا چاہیئے کہ ہم ابھی اس کے سبب کی تحقیق نہیں کر سکے۔ جسے ہم چانس یا اتفاقیہ کہتے ہیں وہ اس لئے چانس ہوتا ہے کہ ہمیں اس کا سبب معلوم نہیں ہوتا۔

عالمِ مشیت میں البتہ ایک چیز ایسی ہے جسے ہم Cause and Effect (سبب اور علّت) کے اصول پر نہیں سمجھ سکتے، اور وہ ہے پہلے پہل، خدا کا اس کائنات کو عدم سے وجود میں لانا۔ یہ چیز ہمارے کائناتی اسباب میں نہیں آتی، ہم کائنات کے طبیعی سبب کو معلوم نہیں کر سکتے۔ آغاز کائنات کے لئے خدا نے کہا کہ اس کو ہم بغیر سبب Cause کے عدم سے بغیر کسی سابقہ مسالے کے وجود میں لے آئے ہیں، لیکن جب ہم اس کائنات کو وجود میں لے آئے ہیں تو اب یہاں ہر Effect (علّت) کا ایک Cause (سبب) ہوگا اور وہ خدا کا مقرر کردہ ہے، جس میں نہ کوئی تبدیلی کر سکتا ہے اور نہ خدا اپنے قوانین میں تبدیلی کرے گا۔ کائنات کو عدم سے وجود میں لے آنا انسانوں کے لئے خدا کا معجزہ ہے جس کی وجہ معلوم کرنے میں انسان ہمیشہ ہی عاجز رہے گا۔ اگر کوئی پوچھے کہ خدا نے اس سلسلہ کائنات کو کیوں اور کس طرح بنایا تو اس کا جواب اس کے سوا کچھ نہیں دیا جا سکتا کہ خدا نے اپنی مرضی سے جس طرح چاہا بنا دیا۔ اس مقام پر مشیتِ خداوندی، ہمارے تصورات کے مطابق، کسی قاعدے اور قانون کی پابندیوں میں جکڑی ہوئی نہیں ہوتی۔ حتیٰ کہ کسی کو بھی جس میں رسول بھی شامل ہوتا ہے، علم نہیں دیا گیا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ (3:127)

(اے رسول) تیرے (یا کسی اور کا) اس عالم امر کے قانون میں کوئی اختیار نہیں۔

یہ خدا کا عالم امر ہے جہاں ہر شے اس کی سکیم کے مطابق وجود میں آتی ہے یعنی اس کی تخلیق کا آغاز ہوتا ہے اور اسکے لیے قوانین مقرر ہوتے ہیں۔ عالم امر میں قانون مشیت کی وضاحت میں قرآن کریم نے درجِ ذیل اصطلاحات تراکیب استعمال کی ہیں، جن کو نظریہ جبریہ و قدریہ دونوں اپنے نظریہ کے حق میں پیش کرتے ہیں۔

1۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰہ

2۔ ما شَاءَ اللّٰہ

3۔ فعل ما یشاء یا یحکم ما یرید

4۔ انشاء اللّٰہ

5۔ من یّشاءُ

6۔ وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰہُ

ہم اِن دونوں کے مؤقف کا زیرِ بحث قرآنی اصطلاحی تراکیب کا اُن ہی کی طرف سے پیش کردہ مفہوم کی روشنی میں تنقیدی جائزہ پیش کر رہے ہیں۔

1. وَلَوْ شَاءَ اللّٰہ کا مفہوم

قرآن کریم میں یہ ترکیب متعدد مقامات میں آئی ہے اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے اگر اللہ چاہتا تو.....

وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا (6:107)

''اور اگر اللہ چاہتا تو لوگ شرک نہ کرتے''

اس کا اوپر جو اسلاف کی طرف سے ترجمہ کیا جاتا ہے، وہ قدریہ کے نزدیک قرآن کی مجموعی تعلیم کے منافی ہونے کی وجہ سے صحیح نہیں ہے، بلکہ اس کا صحیح ترجمہ یوں کرنا چاہیے کہ

''اگر اللہ اس قسم کا قانون مشیت مقرر کر دیتا، تو لوگ شرک نہ کرتے۔''

مثلاً اگر کہا جائے کہ نمک، نمکیں کیوں ہے تو اس کا جواب یہ ہوگا کہ خدا کا قانون مشیت یہ ہے کہ نمک نمکین ہو۔ اگر اس کا قانون مشیت یہ ہوتا کہ نمک میٹھا ہو، تو نمک میٹھا ہو جاتا۔ اگر یہ پوچھا جائے کہ ''اگر خدا چاہے تو اب بھی نمک میٹھا ہو سکتا ہے یا نہیں'' تو اس کے جواب میں یہ کہا جائے گا کہ ''اگر وہ چاہے تو ایسا بھی ہو سکتا ہے، لیکن وہ ایسا چاہے گا نہیں'' کیونکہ اس نے قوانین مشیت مقرر کر دینے کے بعد خود ہی کہہ دیا ہے کہ وہ ان قوانین میں تبدیلی نہیں کرے گا۔

اس ترکیب (لوشاء) میں (عربی زبان کی رو سے) لو کے معنی یہ ہیں کہ اب یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ سیوطی نے اتقان میں کہا ہے کہ: ''ابن ابی حاتم نے ضحاک کے طریق پر ابن عباس سے روایت کی ہے انھوں نے کہا ہے کہ قرآن شریف میں جس جگہ بھی ''لو'' آیا ہے، اس کے معنی ہیں کہ یہ بات کبھی نہیں ہوگی۔ (اتقان حصہ اول۔ چالیسویں نوع)''۔

قرآن کریم نے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ کی ترکیب سے درجِ ذیل آیت سے بھی دونوں جبریہ اور قدریہ کے مؤقف کی وضاحت کی ہے کہ:

وَقَالَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا لَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا عَبَدْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ نَّحْنُ وَلَآ اٰبَآؤُنَا وَلَا حَرَّمْنَا مِنْ دُوْنِهٖ مِنْ شَيْءٍ ؕ كَذٰلِكَ فَعَلَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ فَهَلْ عَلَى الرُّسُلِ اِلَّا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ (16:35)

اور جن لوگوں نے خدا کے اقتدار و اختیار میں دوسروں کو بھی شریک کیا، وہ کہتے ہیں کہ ''اگر خدا چاہتا تو ہم اور ہمارے آباء و اجداد، خدا کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کرتے، اور نہ ہی اُس کے حکم کے بغیر ہم کسی چیز کو حرام قرار دیتے''۔ ان سے پہلے لوگوں نے بھی اسی قسم کی روش اختیار کر رکھی تھی۔ (صحیح راہ پر چلانا رسولوں کی ذمہ داری نہیں تھی) رسولوں پر تو صرف اتنی ذمہ داری تھی کہ جو وحی انہیں دی جائے، اسے واضح طور پر لوگوں کو پہنچا دیں۔

لہٰذا نظریہ جبریت کے حق میں درجِ بالا آیت میں بھی وَلَوْ شَاءَ اللہ کا مطلب میں لَوْ کے اضافہ۔ کے ساتھ ''اللہ چاہتا'' نکالنا صحیح نہیں ہے۔ اس ترکیب کے علاوہ مشیت کے قرآنی تصور ''ماشاء اللہ'' کی ترکیب استعمال کر کے بھی وضاحت کی گئی ہے۔

2۔ ماشاء اللہ کا مفہوم:

ہمارے ہاں اس کا عام طور پر ترجمہ کیا جاتا ہے ''جو اللہ چاہے گا'' اور اس سے نظریہِ جبریت حق میں مراد یہ لی جاتی ہے کہ ہم جو جی میں آئے کر لیں، ہوگا وہی جو خدا چاہے گا۔

قرآن کریم میں بعض مقامات پر الاّ مَا شَاءَ اللہ آتا ہے۔

سَنُقْرِئُكَ فَلَا تَنْسَىٰ ۝ إِلَّا مَا شَاءَ اللَّهُ ط (87:6-7)

''اے رسول! ہم نے تجھے قرآن کو اس انداز سے دیا ہے کہ تو اس میں سے کچھ بھی بھول نہیں سکتا''۔ اس کے بعد ہے الا ماشاء اللہ۔ اس کے نظریہ جبر کے مفہوم پر مبنی یہ معنی نہیں کہ تُو اس میں صرف اتنا بھلا سکتا ہے، جتنا خدا چاہے۔ اس سے زیادہ نہیں بھلا سکتا۔

مفتی محمد عبدہ نے اپنی تفسیر میں وضاحت کی ہے کہ ''استثناء بالمشیت'' قرآن میں آئے تو ہر جگہ ثبوت اور استمرار کے لیے آتا ہے۔ یہاں اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کچھ کہا گیا ہے اس کے خلاف نہیں ہوگا یعنی خدا کی طرف سے حضور کو جو وحی عطا ہوئی تھی اس کا ایک حرف بھی بھلایا نہیں جا سکتا۔ اس مقام پر الا کہنے سے یہ مقصود ہوتا ہے کہ ان امور کا ثابت اور دائم رہنا خدا کی مشیت کی رو سے ہے۔ اگر اس کی مشیت اس کے خلاف ہوتی تو وہ انھیں ویسا ہی بنا دیتا۔ اس آیت سے یہ بتلانا بھی مقصود ہے کہ اللہ اپنے قانون مشیت میں تبدیلی نہیں کرتا۔

3۔ یفعل ما یشاء یا یحکم ما یرید کا مفہوم

اس عنوان کی تراکیب کا ترجمہ یوں ہے کہ:

''وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے'' یا ''وہ جو ارادہ کرتا ہے اس کے مطابق فیصلہ کرتا ہے''۔

اس کو سمجھنے کے لیے ہم نے اسی قانون مشیت کے عنوان میں وضاحت کی ہے کہ خدا کے تخلیقی مراحل کے دو پروگرام ہیں۔ مرحلہ اول، عالم امر کا ہے جس میں ''خدا'' اشیاء کو عدم سے وجود میں لاتا اور ان کے حفظ و بقاء، نشوو ارتقاء اور محو و ثبات کے لیے قوانین (قدر) مقرر کرتا ہے۔ اس مرحلہ میں اس کی قدرت مطلقہ اس طرح کارفرما ہوتی ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کے لیے نہ پہلے سے کوئی قاعدہ اور قانون مقرر ہوتا ہے، نہ کوئی حدود و قیود عائد۔ یہاں يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ ط (42:49) کے معنی ہیں ''وہ جو جی میں آئے پیدا کرتا ہے''۔ یا پھر إِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ (22:14)

''جو کچھ اس کے ارادے میں ہوتا، وہ ویسے ہی کرتا ہے''۔

یہ سب تراجم اور مفہوم جبریت کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور صحیح ہیں لیکن یہ اس کے عالم امر سے متعلق ہیں جس کے متعلق کہا: لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ (21:23)

اس سے کوئی نہیں پوچھ سکتا جو اس نے کیا ہے، اور سب سے پوچھا جا سکتا ہے۔

4۔ انشاء اللہ کا مفہوم:

ہمارے ہاں اس کے معنی نظریہ جبریت کے حق میں کیے جاتے ہیں ''اگر اللہ نے چاہا تو''۔ یہ معنی کثرت استعمال سے گویا ہمارا تکیہ کلام بن گئے ہیں، یہاں ان شاء اللہ میں ''شاء'' کا مفہوم ہم مشیت کے تحت ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ اِس

سے مراد خدا کا قانون مشیت ہوتا ہے۔ باقی رہا حرف ''اِن'' تو اس کے معنی عام طور پر ''اگر'' کیے جاتے ہیں، لیکن عربی گرامر کی رو سے کہا جائے گا کہ یہ سبب بیان کرنے کے لیے بھی آتا ہے، یعنی جس مفہوم کے لیے ہم اردو زبان میں ''چونکہ'' استعمال کرتے ہیں۔ عربی زبان میں ان معانی کے لیے ''اِن'' بھی آتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں سیوطی نے اتقان میں بیان کی ہیں۔ لہٰذا انشاء اللہ کا مفہوم یوں ہوگا:

''جو کچھ میں کر رہا ہوں چونکہ یہ خدا کے قانون مشیت کے مطابق ہے اس لیے اس کا نتیجہ ایسا مرتب ہو کر رہے گا یا بالفاظ دیگر جو کچھ میں کر رہا ہوں تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اس کا نتیجہ ایسا نہ نکلے۔ لہٰذا ایسا ہو کر رہے گا۔

5۔ مَن یَّشَآءُ کا مفہوم:

ان کا ترجمہ بحق نظریہِ جبریت یوں کیا جاتا ہے کہ جسے چاہے جیسے قرآن کریم کا ارشاد ہے کہ:

یُضِلُّ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡ مَنۡ یَّشَآءُ ؕ (16:93)

''وہ جسے چاہتا ہے ہدایت دیتا ہے جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے۔''

اگر اس قسم کی آیات کے یہی معنی لیے جائیں جو ان کے عام ترجموں کی رو سے متعین ہوتے ہیں تو یہ انہی مضامین سے متعلق قرآن کریم کی بے شمار آیات کے خلاف جاتی ہیں۔ مثلاً ہدایت کی درج بالا آیت کے بالمقابل قرآن ہدایت وضلالت کے متعلق وضاحت کرتا ہے۔

وَقُلِ الۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّکُمۡ ۟ فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ ۙ (18:29)

''ان سے کہہ دو کہ حق خدا کی طرف سے آ گیا ہے اب جس کا جی چاہے اسے قبول کر لے۔ جس کا جی چاہے اس سے انکار کر دے۔''

عربی زبان کے قاعدے کی رو سے ''مَنۡ یَّشَآءُ'' کے دو معنی ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ ''جیسی اللہ چاہے'' اور دوسرا یہ کہ ''جو شخص ایسا چاہے'' جیسے ہدایت وضلالت کے متعلق درج بالا آیت کے ایک معنی یہ ہو سکتے ہیں جیسا کہ مروجہ تراجم کی مدد سے کیے گئے ہیں کہ ''اللہ جسے چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے، اور جسے چاہتا ہے گمراہ کر دیتا ہے''۔ اس کے دوسرے معنی قرآن کی دیگر آیات کی مطابقت میں یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ جو شخص ہدایت لینا چاہے، اسے ہدایت مل جاتی ہے اور جو گمراہ رہنا چاہے، وہ گمراہ رہتا ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ ان دونوں معانی میں ترجیح کن معانی کو دی جائے گی۔ ہمارے فہم قرآن کے اصولوں کی مدد سے اس کا جواب آسان ہے۔ ان آیات کا وہ مفہوم صحیح ہوگا جو قرآن کریم کی دیگر آیات اور اس کی کھلی تعلیم کے مطابق ہو۔ قرآن کریم کی کلی تعلیم کا محور، قانون مکافات عمل ہے یعنی انسان کو اس کے اعمال کا نتیجہ ملتا ہے۔ لہٰذا ان جیسی آیات کا وہی مفہوم قرآنی تعلیم کے مطابق ہوگا جس میں ''مَنۡ یَّشَآءُ'' کا فاعل انسان کو تصور کیا جائے۔

بعض آیات میں مَنۡ یَّشَآءُ ''جیسے ہم چاہیں'' یا من اشاء ''جسے میں چاہوں'' کے الفاظ آتے ہیں لہٰذا ان آیات میں فاعل تو بہر حال اللہ ہی ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم وضاحت کر چکے ہیں کہ ''خدا کے چاہنے'' سے مراد ہے ''خدا کے قانون مشیت کے مطابق'' اس سے اس آیت کا مفہوم واضح ہو جاتا ہے اور اس مطلب کی تائید قرآن کریم سے بھی تصریف آیات کی روشنی میں ہو جاتی ہے۔

نَرۡفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنۡ نَّشَآءُ ؕ (6:83)

''ہم اپنے قانون مشیت کے مطابق درجات بلند کرتے ہیں۔''

اس قانون مشیت کی وضاحت قرآن کی رو سے یہ ہے کہ:

وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوۡا ۚ (46:19)

''ہر ایک کے درجات اس کے اعمال کے مطابق متعین ہوتے ہیں۔''

6۔ وَمَا تَشَآءُوۡنَ اِلَّاۤ اَنۡ يَّشَآءَ اللّٰهُ ؕ (76:30)

''اور تم وہی چاہو جو اللہ چاہتا ہے''۔

اس آیت کا نظریہ جبریت کی تائید میں ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے اور تم نہیں چاہو گے مگر جو چاہے اللہ اس آیت کے مفہوم میں لغوی بحث کرتے ہوئے وضاحت کی جاتی ہے کہ ''مَا تَشَآءُوۡنَ'' فعل نفی مضارع ہے جس کے عام معنی ہیں۔ ''تم نہیں چاہتے'' لیکن عربی گرائمر کی رو سے اس کے معنی فعل نہی (مت کرو) کے بھی ہوتے ہیں یعنی ''تم مت چاہو'' گرائمر کی اصطلاح میں اسے کہتے ہیں خبر کا ''انشا'' کے معنوں میں استعمال ہونا۔

اِسے مختصر المعانی کے صفحہ 232 پر واضح کیا گیا ہے کہ کبھی کبھی خبر انشاء کی جگہ بھی مستعمل ہو جاتی ہے۔

زمخشری کی تفسیر کشاف نے اس لغوی نکتہ کی وضاحت سورہ بقرہ کی آیت 283:2 کے حوالے سے کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:

لَا تَعۡبُدُوۡنَ اِلَّا اللّٰهَ ۟ (2:83)

تُم عبادت نہ کرو ماسوائے اللہ کی:

زمخشری نے لکھا ہے کہ لَا تعبدُونَ نفی مضارع ہے، لیکن اس کے معنی فعل نہی کے ہیں۔ اس نے اس کی وضاحت کی ہے کہ اس آیت میں اخبار فی معنی النہی ہے۔ یعنی خبر، نہی کے معنوں میں ہے۔ اس کی مزید وضاحت میں کہ ''وَھُوَ ابلغ من صریح الۡاَمر وَالنھی'' یعنی یہ انداز امر و نہی کے صغیوں کے ذریعہ صاف حکم دینے یا منع کرنے کے مقابلہ میں زیادہ بلیغ ہوتا ہے۔ قرآن کریم میں اس انداز بیان کی اور مثالیں بھی ہیں۔ جس کی ایک مثال یوں ہے۔

وَمَا تُنۡفِقُوۡنَ اِلَّا ابۡتِغَآءَ وَجۡهِ اللّٰهِ ؕ (2:272)

''تم مت خرچ کرو بجز خدا کی خوشنودی کے۔''

یعنی یہاں مضارع نے نہی کے معنی دیئے ہیں۔

آیت مذکور عنوان کا اگر عام ترجمہ یہ کیا جائے ''اور تم نہیں چاہتے مگر وہ جو چاہے اللہ'' تو یہ نظریہ جبریت کے حق میں قرآن کی دوسری آیت کی نقیض ہو جاتی ہے۔ جہاں انسان کو اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو ایمان لائے اور چاہے تو کفر اختیار کرے۔ لہٰذا ان تصریحات کی روشنی میں زیر عنوان آیت کے معنی واضح ہو جاتے ہیں کہ ہم نے تمہیں اس کا اختیار دے رکھا ہے کہ تم جیسا جی چاہے کرو۔ لیکن تمہیں چاہیے کہ اپنے اختیار و ارادہ کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ رکھو۔ یعنی تم وہی چاہو، جو ہم چاہتے ہیں۔

اس ساری بحث سے ہم یہ نتیجہ نکالنے میں حق بجانب ہیں کہ اصلی محرک عالمِ خواہش ہے جو صدرِ افعال کا باعث بن کر ارادوں کو بناتی بھی ہے اور بگاڑتی بھی۔ لہٰذا قرآن مومنین کو یہی ہدایت دیتا ہے کہ اگر وہ اپنی خواہشات اور ارادوں کو وحی خداوندی کی روشنی میں اپنی بصیرت سے خدا کی مشیت سے ہم آہنگ کرنے میں کامیاب ہو جائیں تو اس ارض (دنیا) میں ارتقاء کی انتہاء کے مقامِ نفسِ مطمئنہ کو حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس حالت میں وہ انسان کے مقام سے بھی گر کر نفس لوامہ کے حیوانی مقام میں آجاتے ہیں۔

اِسی روش کے اختیار کرنے کی تلقین علامہ اقبال اپنے مخصوص انداز میں کرتے ہیں کہ

تیری دعا ہے کہ ہو تیری آرزو پوری مری دعا ہے تری آرزو بدل جائے

یہ اِس لئے کہ آرزو کے بدل جانے سے، انسان کی ساری دنیا بدل جاتی ہے۔ خدا کہتا ہے کہ تم اپنی آرزو کو اس طرح بدلو کہ وہ ہمارے قانون مشیت سے ہم آہنگ ہو جائے۔

تری دعا سے قضاء تو بدل نہیں سکتی مگر ہے اِس سے یہ مُمکن کہ تو بدل جائے

وَمَا تَشَآءُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّشَآءَ اللّٰهُ ۭ (76:30)

کا مفہوم یہ ہے کہ ''تمہیں اس کا اختیار ہے کہ تم اپنے لیے جو فیصلہ چاہو کر لو لیکن جب تمہیں اس کا اختیار ہے تو تم وہی کیوں نہ چاہو، جو ہمارے قانون مشیت کا منشاء ہے۔'' تم اپنے اختیار کو ہماری مشیت سے ہم آہنگ کیوں نہ کر لو۔ اس سے تم خوشگواریوں کی زندگی بسر کرو گے۔

اگلے باب میں نظریہ انسانی ذات کی دوسری بنیادی صِفت عِلم کے کردار پر بحث ہوگی۔

عمر احمد عثمانی مرحوم

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی معاشرہ

باہمی تعلقات کے متعلق قرآن کی تعلیم

اولاد:

اولاد کے ساتھ ماں باپ کے تعلق کے دو گوشے ہوتے ہیں۔ ایک گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسانی جبلّت سے ہے۔ مثلاً اولاد کے ساتھ محبت اور شفقت کا برتاؤ کرنا۔ ان کی پرورش کرنا۔ ماں کا اپنے بچوں کو دودھ پلانا۔ باپ کا ان کے کھانے، کپڑے کے لیے جگر پاش مشقتوں کو برداشت کرنا۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو ہر انسان میں جبلی طور پر موجود ہوتی ہیں۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا کہ یہ تقاضے کچھ انسانی جبلّت کے ساتھ ہی مخصوص نہیں بلکہ حیوانات تک میں بھی یہ چیزیں پائی جاتی ہیں۔ وہ بھی اپنی اولاد کی پرورش میں ان تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں۔ چڑیا کی ننھی سی جان کو دیکھئے۔ وہ اپنے بچوں کی حفاظت وصیانت کے لیے اپنی جان جوکھوں میں ڈال دیتی ہے۔ اس چھوٹی سی مرغی کو دیکھئے جس نے ابھی ابھی بچے نکالے ہوں۔ چیل یا کوّے کا سایہ بھی کہیں نظر آتا ہے تو وہ عقاب کی طرح دوڑتی ہوئی آتی ہے اور اپنے پروں کے نیچے اپنے بچوں کو سمیٹ لیتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے پرندے صبح صبح دانہ دنکا اکٹھا کرنے کے لیے نکل جاتے ہیں وہ یہ چیزیں جمع کر کے لاتے ہیں اور چونگے کی شکل میں اپنے ننھے منے بچوں کے منہ میں انڈیل دیتے ہیں۔ یہی حال چوپایوں اور دوسرے جانوروں کا بھی ہے۔ یہ گوشہ چونکہ انسانی بلکہ حیوانی جبلّت سے تعلق رکھتا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کسی ہدایت کی ضرورت ہی نہیں۔ جس طرح بکری کو کوئی یہ نہیں سکھاتا کہ جب اس کا بچہ پیدا ہو تو وہ اسے کس طرح دودھ پلائے۔ اسی طرح کسی لڑکی کو اس تعلیم کی ضرورت نہیں کہ جب اس کے بچے پیدا ہوں تو وہ اس کو دودھ پلائے اور سردی وگرمی سے اس کی حفاظت کیا کرے۔ اس کے لیے تعلیم وہدایت کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ لڑکی جب جوان ہوگی اور اس کے بچے پیدا ہوں گے تو اس کی جبلّت اسے خود ہی بتادے گی کہ اب اسے کیا کرنا چاہئے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے زندگی کے اس گوشہ سے متعلق زیادہ ہدایات دینے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ البتہ اس جبلی تقاضہ میں بھی چوں کہ افراط اور تفریط ہوسکتی ہے۔ اس لیے قرآن کریم نے اس کی حدود ضرور مقرر کردی ہیں۔

اس تعلق کا دوسرا گوشہ وہ ہے جس کا تعلق انسان کی جبلّت سے نہیں ہے۔ مثلاً بچہ اگر بے راہ روی اختیار کرنے

لگے تو والدین کو اس کے ساتھ کیا برتاؤ کرنا چاہئے۔ اس کی تعلیم وتربیت کس طریقہ پر کرنی چاہئے۔ اس کی کن صلاحیتوں کو اجاگر کرنا چاہئے۔ ہمیں اپنے دلوں میں اپنے بچوں کے لیے کس قسم کی آرزوئیں اور تمنائیں رکھنی چاہئیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اس قسم کی چیزیں ہیں کہ انسان بسا اوقات جذبات کی رو میں غلط قدم اٹھانے پر مجبور ہوجاتا ہے۔ اولاد کی بے جا اور غلط محبت اکثر اسے غلط راستے پر ڈال دیتی ہے۔ زندگی کے اس گوشہ کے متعلق انسان کو وحی کی راہنمائی کی ضرورت ہے اور قرآن کریم نے اِس ضمن میں ہمیں کافی ہدایات دی ہیں۔

اولاد کی خواہش معیوب نہیں:

ہر انسان کو فطری طور پر یہ خواہش ہوتی ہے کہ اس کے اولاد ہو اور وہ اس کو پرورش کرے آپ نے چھوٹی چھوٹی بچیوں کو دیکھا ہوگا کہ جونہی وہ چار پانچ سال کی ہوتی ہیں تو چھوٹی چھوٹی گڑیاں گودوں میں لے کر گھومنے پھرنے لگتی ہیں۔ کسی کو اگر گڑیاں نہیں ملتیں تو اپنے تکیوں ہی سے اپنے اس تقاضے کو پورا کرلیتی ہیں۔ ذرا اور بڑی ہوتی ہیں تو وہ گڑیوں کے شادی بیاہ کا ڈھونگ رچانے لگتی ہیں۔ بہرحال انسان کا یہ جذبہ بالکل فطری ہے جسے معیوب نہیں کہا جاسکتا۔ یہ خواہش بڑے بڑے انبیاء تک کو بھی ہوئی ہے اور انہوں نے اپنی اس آرزو کا اظہار جنابِ باری میں بھی کیا ہے چنانچہ قرآن کریم نے حضرت زکریاؑ کی اس دعا کو اپنے دفتین میں محفوظ کیا ہے۔ جس میں وہ عرض کرتے ہیں۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَکَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ۝ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ۝ (19:5-6)

مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا! مجھے اپنے پاس سے ایک ایسا مددگار عطا فرما جو میرا اور آل یعقوب کا جانشین ہو، اور خدایا! اسے پسندیدہ صورت وسیرت کا مالک بنا۔

اولاد کو حیاتِ جاوید کا ذریعہ سمجھنا غلط ہے:

اولاد کی خواہش کا پیدا ہونا ایک فطری تقاضا ہے۔ جو انبیائے کرام تک میں بھی پیدا ہوتی ہے۔ اس لیے اسے معیوب نہیں کہا جاسکتا البتہ یہ سمجھنا کہ میں تو کچھ عرصہ کے بعد مرجاؤں گا میرا نام میرے بعد میری اولاد کے ذریعہ سے ہی چلے گا۔ یہ غلط ہے۔ اس خیال کے دونوں مقدمے غلط ہیں یہ مقدمہ بھی غلط ہے کہ میں تو کچھ عرصہ کے بعد مرجاؤں گا۔ کیونکہ انسان کی زندگی حیات دنیوی کے ختم ہونے کے ساتھ ختم نہیں ہوجاتی۔ زندگی ایک جوئے رواں ہے جو اس زندگی کے بعد بھی چلتی ہے۔ موت اس کو ختم نہیں کردیتی۔ ہوتا صرف یہ ہے کہ زندگی کا زاویہ بدل جاتا ہے۔ پھر اس کے بعد یہ دوسرا مقدمہ بھی غلط ہے کہ میرے بعد میرا نام میری اولاد کے ذریعہ سے چلے گا۔ انسان کا نام اس کی اولاد کے ذریعہ سے نہیں چلتا بلکہ اس کے صلاحیت بخش اعمال کے ذریعہ سے چلتا ہے۔ یہی وہ فریب تھا جو ابلیس نے آدم کو دیا تھا۔ جب اس نے کہا تھا۔

قَالَ یٰۤاٰدَمُ هَلْ اَدُلُّكَ عَلٰی شَجَرَةِ الْخُلْدِ وَمُلْكٍ لَّا یَبْلٰی ۝ فَاَكَلَا مِنْهَا فَبَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا یَخْصِفٰنِ عَلَیْهِمَا مِنْ وَّرَقِ الْجَنَّةِ ۛ وَعَصٰۤی اٰدَمُ رَبَّهٗ فَغَوٰی ۝ (20:120-121)

ابلیس نے کہا۔ اے آدم آ، میں تجھے حیاتِ جاوید کے درخت کا پتہ بتاؤں اور ایسی بادشاہت کا نشان دے دوں جو کبھی پرانی نہیں ہوگی۔ آدم اور اس کی بیوی نے اس درخت سے کھایا ہی تھا کہ دونوں کا جنسی شعور بیدار ہوگیا اور دونوں اپنے اوپر باغ کے پتے گانٹھنے لگے۔ آدم نے اپنے رب کی نافرمانی کی اور وہ راستہ سے بھٹک گیا۔

انسان میں حیاتِ جاوید کی تمنا ابتداء سے چلی آرہی ہے اور یہ کوئی معیوب خواہش نہیں۔ لیکن حیاتِ جاوید حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اپنے صلاحیت بخش اعمال سے اپنی ذات یعنی نفس انسانی (Personality) کو اتنا مستحکم کرلے کہ موت کا ہاتھ اس کو ختم نہ کرسکے۔ حیاتِ جاوید حاصل کرنے کا یہ طریقہ نہیں کہ انسان اولاد پیدا کرلے اور پھر اولاد کے ذریعے سے اپنا نام چلانے کی کوشش کرے۔ کیونکہ ساری مفاد پرستیاں اور ذخیرہ اندوزیاں اسی جذبے کے ماتحت فروغ پاتی ہیں۔ تحفظِ خویش انسان کا فطری تقاضا ہے۔ وہ اولاً براہِ راست اپنے تحفظ کے لیے اور پھر اولاد کے ذریعہ سے ذخیرہ اندوزیاں اور سرمایہ داریاں اور جاگیرداریاں شروع کردیتا ہے۔ جس سے انسانیت میں بے شمار فتنوں اور ناہمواریوں کا دروازہ کھل جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشوونما اور بالیدگی ذخیرہ اندوزیوں سے نہیں ہوتی بلکہ انفاق اور دوسرے انسانوں کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانے سے ہوتی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی ۝۵ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی ۝۶ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْیُسْرٰی ۝۷ وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰی ۝۸ وَکَذَّبَ بِالْحُسْنٰی ۝۹ فَسَنُیَسِّرُہٗ لِلْعُسْرٰی ۝۱۰

(92:5-10)

جو دیتا ہے اور قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ رہتا ہے یعنی توازن بدوش انسانیت کے نظریہ کو سچ کر دکھاتا ہے تو ہم اس کے لیے سہولتوں اور آسانیوں کے لیے دروازے کھول دیتے ہیں۔ لیکن جو لوگ بخل کرتے ہیں اور زیادہ سے زیادہ مالدار بننے کی خواہش کرتے ہیں اور توازنِ انسانیت کو غلط کر دکھاتے ہیں۔ ان کے لیے ہم دشواریوں کی راہیں کھول دیتے ہیں۔

بہرحال اولاد کی خواہش پیدا ہونا معیوب نہیں۔ البتہ اس کے ذریعہ سے حیاتِ جاوید حاصل کرنے کی خواہش رکھنا غلط ہے۔ اولاد کی خواہش تو حیوانی جبلّت کا بھی تقاضا ہے۔ مگر ان کے ہاں چونکہ یہ جذبہ نہیں ہوتا کہ اولاد کے ذریعہ سے ان کا نام چلے گا۔ اس لیے نہ وہ ذخیرہ اندوزیاں کرتے ہیں اور نہ سرمایہ داریوں اور جاگیرداریوں کو پیدا کرتے ہیں۔ لہٰذا اولاد کی خواہش میں کوئی برائی نہیں۔ مگر اس کو حیاتِ جاوید کا ذریعہ سمجھنے میں یقیناً برائی ہے۔

اولاد خدا کی نعمت ہے:

انسان کو خدا کی طرف سے اولاد مل جانا خدا کا بڑا انعام ہے جس کی ہمیں ناشکری نہیں کرنی چاہئے۔ تکمیل مقصدِ انسانیت کے لیے بقائے نسلِ انسانی ضروری ہے۔ ہمیں اس نعمت کی قدر کرنی چاہئے اور کوشش کرنی چاہئے کہ ہماری یہ اولاد انسانیت کی نشوونما اور ارتقاء کا ذریعہ بنے۔ اور اس سلسلہ میں جو کام ہم مکمل نہ کرسکیں۔ اسے ہماری اولاد پایۂ تکمیل تک پہنچائے۔

وَاللّٰہُ جَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَنْفُسِکُمْ اَزْوَاجًا وَّجَعَلَ لَکُمْ مِّنْ اَزْوَاجِکُمْ بَنِیْنَ وَحَفَدَۃً وَّرَزَقَکُمْ مِّنَ الطَّیِّبٰتِ ؕ اَفَبِالْبَاطِلِ یُؤْمِنُوْنَ وَبِنِعْمَتِ اللّٰہِ ھُمْ

يَكْفُرُوْنَ ﴿72﴾ (16:72)

اور اللہ نے تمہارے ہی میں سے تمہارے جوڑے پیدا کیے اور تمہاری بیویوں سے تمہارے بیٹے اور پوتے (اور دوسرے مددگار) پیدا کیے اور خوشگوار چیزیں تمہیں بطور رزق کے عطا کیں۔ کیا وہ لوگ باطل توہمات پر تو یقین رکھتے ہیں اور اللہ کی ان نعمتوں کا صاف انکار کر دیتے ہیں؟

اور رحمت بھی:

اولاد خدا کی نعمت ہی نہیں بلکہ اس کی رحمت بھی ہے۔ یعنی بچے کی پرورش کا سامان بھی خود رزاقِ کائنات کی طرف سے مہیا ہوتا ہے۔ اسی کو رحمت کہتے ہیں خواہ یہ جسمانی نشوونما کے لیے ہو یا انسانی ذات کے استحکام و ارتقاء کے لیے۔ جہاں تک بچہ کی جسمانی پرورش کا تعلق ہے ذرا غور کیجئے کہ رحم مادر کے اندر جنین کس طرح قانون خداوندی کے تابع پروان چڑھتا ہے۔ ماں کے رحم میں اس کی ضروریات خدا کس طرح مہیا کرتا ہے۔ تا آنکہ وہ ایک مدت معینہ کے بعد ایک جیتا جاگتا مکمل بچہ بنجاتا ہے۔ پھر وضع حمل کے مرحلہ سے گذر کر جب وہ ماں کی گود میں آجاتا ہے تو روشنی، ہوا، پانی اور ماں کی چھاتیوں میں دودھ کس طرح اس کے لیے چشم براہ بلکہ دست بستہ حاضر ہوتے ہیں مختلف مرحلوں میں اس کے تقاضے کس قدر مختلف ہوتے ہیں مگر ہر مرحلہ پر خدا کی نعمتوں کا خوانِ یغما کس طرح اسے ہاتھوں ہاتھ لیتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ جوانِ رعنا ہو جاتا ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ ان تمام مراحل میں انسان نے کیا کچھ کیا اور خدا کی شانِ رحمت نے اس میں کتنا کچھ حصہ لیا ہے۔

وَاِنِّیْ خِفْتُ الْمَوَالِیَ مِنْ وَّرَآءِیْ وَكَانَتِ امْرَاَتِیْ عَاقِرًا فَهَبْ لِیْ مِنْ لَّدُنْكَ وَلِیًّا ﴿5﴾ یَّرِثُنِیْ وَیَرِثُ مِنْ اٰلِ یَعْقُوْبَ ۗ وَاجْعَلْهُ رَبِّ رَضِیًّا ﴿6﴾ (19:5-6)

یہ تیرے پروردگار کی اس رحمت کا ذکر ہے جو اس نے اپنے بندے زکریا پر فرمائی تھی۔ جب اس نے اپنے پروردگار کو آہستہ سے پکارا۔ اس نے کہا اے میرے پروردگار میری ہڈیاں کمزور ہوگئی ہیں اور سر بڑھاپے سے سفید ہو چکا ہے۔ میں آج تک کبھی تجھے پکار کر محروم نہیں رہا مجھے اپنے بعد اپنے بھائی بندوں سے اندیشہ ہے اور میری بیوی بانجھ ہے۔ خدایا تو مجھے اپنے پاس سے ایک مددگار عطا فرما!

آپ نے دیکھ لیا کہ یہاں حضرت زکریاؑ کی دعا پر ان کو یحییٰؑ جیسا بیٹا عطا فرمانے کو رحمتِ ربانی قرار دیا گیا ہے۔

دنیوی زندگی میں اولاد تقویت کا باعث ہے:

اولاد خدا کی نعمت اور رحمت اس لیے ہے کہ اس سے اس دنیا میں ہمیں تقویت حاصل ہوتی ہے۔ ہماری کارکردگی کی صلاحیت بڑھ جاتی ہے۔ جب سے انسان نے منزلِ انسانیت میں قدم رکھا ہے۔ گھر کی زندگی (FAMILY LIFE) اس کا مستقل شعارِ حیات رہا ہے۔ یہ اس سے کسی دور میں بھی مستغنی نہیں ہوا۔ اس طرز زندگی کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کی اولاد اس کے دکھ درد میں شریک ہوتی ہے۔ ایک سے دوسرے کو سکون اور اطمینان نصیب ہوتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دست وبازو ہوتے ہیں۔ اس لیے آپس میں ایک دوسرے سے تقویت محسوس کرتے ہیں۔ ابتدائی دور کی قبائلی زندگی میں افراد خاندان کی کثرت خاص طور پر وجہ

تقویت ہوتی تھی۔ چنانچہ حضرت نوحؑ نے اپنی قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

فَقُلْتُ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ۭ اِنَّهٗ كَانَ غَفَّارًا ۝ يُّرْسِلِ السَّمَاۗءَ عَلَيْكُمْ مِّدْرَارًا ۝ وَّيُمْدِدْكُمْ بِاَمْوَالٍ وَّبَنِيْنَ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ جَنّٰتٍ وَّيَجْعَلْ لَّكُمْ اَنْهٰرًا ۝ (71:10-12)

میں نے ان سے کہا کہ خدا سے اس کے قانونِ ربوبیت کے مطابق سامانِ حفاظت طلب کرو بلا شبہ وہی سامان حفاظت عطا کرنے والا ہے۔ وہ تم پر بارش کی دھاریں چھوڑ دے گا او راموال واولاد سے تمہاری تقویت کا سامان کرے گا اور تمہارے لیے باغات اور نہریں بنادے گا۔

قوم بنی اسرائیل کے متعلق بھی یہی فرمایا:

وَاِذَآ اَرَدْنَآ اَنْ نُّهْلِكَ قَرْيَةً اَمَرْنَا مُتْرَفِيْهَا فَفَسَقُوْا فِيْهَا فَحَقَّ عَلَيْهَا الْقَوْلُ فَدَمَّرْنٰهَا تَدْمِيْرًا ۝ (17:16)

پھر تمہارے مخالفین کے خلاف ہم تمہاری باری دوبارہ لے آئے اور ہم نے اموال واولاد سے تمہاری تقویت کا سامان کردیا اور ہم نے تمہیں کثیر انبوہ والا بنادیا۔

قومِ عاد کو خطاب کرتے ہوئے حضرت ہودؑ نے بھی یہی فرمایا تھا:

وَاٰتِ ذَا الْقُرْبٰى حَقَّهٗ وَالْمِسْكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَلَا تُبَذِّرْ تَبْذِيْرًا ۝ (17:26)

اس خدا کے قانون سے ہم آہنگ رہو جس نے تمہاری تقویت کے وہ وہ سامان کئے جو تم جانتے ہو۔ اس نے چوپایوں اور اولاد سے اور باغات اور پانی کے چشموں سے تمہاری تقویت کے سامان بہم پہنچائے۔

بہرحال عائلی زندگی کا لازمی نتیجہ ہے کہ ماں باپ اپنی اولاد کے وجود سے ایک خاص قسم کی تقویت محسوس کرتے ہیں۔ اس سے ان کی خاندانی قوت وثروت میں کافی اضافہ ہوتا ہے۔

اولاد زینت کا باعث ہے:

زینت ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو لوگوں کو دیکھنے میں بھلی معلوم ہو۔ ظاہر ہے کہ وہ گھر جو اپنے مکینوں سے بھرا ہوا ہو، جس میں بچوں کی چہل پہل ہو۔ وہ ہر دیکھنے والی نگاہ کو بہ نسبت ایک اجڑے ہوئے گھر کے زیادہ خوش آئند نظر آئے گا۔ یہ تو گھر کی بات تھی۔ اگر نگاہوں میں ذرا اور وسعت پیدا کرکے دیکھا جائے تو درحقیقت ساری دنیا کی زینت بھی اولاد سے (یعنی بقائے نسل انسانی) ہی سے وابستہ ہے۔ اگر انسانی نسل کا انقطاع ہوجائے تو دنیاوی زندگی ہنگاموں سے قطعاً خالی ہوجائے۔ دنیا کی گردش لیل ونہار میں رنگینی ہے، تو اسی کے دم قدم سے ہے۔ بازارِ حیات میں چہل پہل ہے تو اسی کے طفیل ہے۔ یہ نہ ہو تو دنیا پر ایک مرگ آسا خاموشی چھا جائے اور حرکت واضطراب کی جگہ سکوتِ مرگ لے لے۔ اسی کو قرآن کریم نے فرمایا ہے۔

اَلْمَالُ وَالْبَنُوْنَ زِيْنَةُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَالْبٰقِيٰتُ الصّٰلِحٰتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ ثَوَابًا وَّخَيْرٌ اَمَلًا (18:46)

مال اور اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہیں۔ لیکن تیرے پرورش دینے والے کے قانون کے نزدیک وہی اموال اور اولاد بہتر ہیں جو اپنے نتیجہ اور توقعات کے اعتبار سے باقی رہنے والے اور صلاحیت بخش ہوں۔

حیات دنیوی کے اعتبار سے یوں تو ہر اولاد باعث زینت ہے۔ لیکن خدا کے قانون میں وہی اولاد بہتر کہی جاسکتی ہے جو اس دنیا پر اچھے اور صلاحیت بخش اثرات چھوڑ جائے۔ لہٰذا ہمیں یہ مقصد ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت اس انداز سے کریں کہ وہ دنیا پر باقی رہنے والے اثرات چھوڑ کر جائے اور وہ اثرات ایسے ہوں جو ہر اعتبار سے صلاحیت بخش ہوں۔ اگر ہم یہ نہیں کر سکے تو ہم نے اپنا انسانی فریضہ ادا نہیں کیا۔ فقط حیوانی جبلت کے تقاضوں کو پورا کیا۔ ظاہر ہے کہ انسانیت کو ہماری برخود غلط اولاد کے ہاتھوں اگر شدائد و مصائب سے دو چار ہونا پڑا تو وہ رہتی دنیا تک ہم پر لعنتیں بھیجے گی اور اگر اسے اس کے ہاتھوں آرام اور سکون مل سکا وہ برابر ہمارے لیے نیک آرزوؤں کا اظہار کرتی رہے گی۔ لہٰذا ہمارا یہ فرض ہے کہ ہم اپنی اولاد کو ایسا اٹھائیں جو سوسائٹی کے اچھے فرد اور دنیا کے بہترین شہری بن سکیں۔ جن سے انسانیت کی گاڑی پیچھے ہٹنے کے بجائے میدانِ ارتقاء میں آگے بڑھے، یعنی وہ انسانیت کی بھلائی اور بہتری کے لیے کچھ عملی طور پر کر سکے۔

اولاد سے محبت فطری تقاضا ہے:

''اولاد دنیوی زندگی کی زینت ہے۔'' کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہمیں ان سے محبت نہیں کرنی چاہئے۔ ملّا کے مذہب میں اولاد ایک حد تک قابل نفرت چیز ہے۔ جس سے ہمیں محبت نہیں کرنی چاہئے۔ کیونکہ اولاد ارشادِ خداوندی کے مطابق زینت ٹھہری دنیوی زندگی کی اور دنیا مُلّا کے نزدیک مردار ہے اور اس کے طلب گار اور متلاشی کتے ہیں۔ تو جو خود ہی مردار ہے اس کی زیب و زینت بھی مردار ہوگی اور کسی مردار چیز سے محبت کرنا کس طرح محمود ہوسکتا ہے مگر یہ تعلیم قطعاً قرآن کے خلاف ہے۔ وہ بتاتا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے اول تو دنیا اور اس کی زیب و زینت کو حرام کس نے قرار دیا ہے تحلیل کا حق تو صرف خدا کو حاصل ہے۔ اگر خدا نے حرام قرار دیا ہے تو بتاؤ کہاں حرام قرار دیا ہے اور اگر تم یہ نہیں بتا سکتے تو ایسی باتیں جن کے متعلق تمہیں کچھ علم نہیں خدا کی طرف منسوب کیوں کرتے ہو۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ (7:32)

اے پیغمبر! کہہ دو کہ خدا کی اس زینت و آرائش کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور خوشگوار رزق کی چیزوں کو آخر کس نے حرام کر دیا ہے؟ اے پیغمبر کہہ دو کہ دنیوی زندگی میں بھی یہ انہی لوگوں کا حصہ ہے جو ایمان لاتے ہیں اور قیامت کے دن تو یہ خالص انہی کا حصہ ہوگا۔ ہم اس طرح اپنی آیات کو نکھار نکھار کر ان لوگوں کے لیے بیان کر دیتے ہیں جو علم رکھتے ہیں۔

لہٰذا دنیا اور اس کی زینت کی چیزیں نہ حرام ہیں اور نہ مردار اور نہ ہی ان سے محبت کرنے والے کتے

ہیں۔ یہ لوگوں کی من گھڑت کہاوتیں ہیں۔ جو انہوں نے خود ہی گھڑ لی ہیں اور خدا کی طرف منسوب کر دی ہیں۔ اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ اولاد کی محبت ایک فطرتی تقاضا ہے جسے نہ ختم کیا جا سکتا ہے اور نہ ہی اسے مطلقاً مذموم قرار دیا جا سکتا ہے۔

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ (3:14)

انسانوں کے لیے عورتوں، اولاد، سونے چاندی کے جمع کیے ہوئے ڈھیروں، نشان زدہ گھوڑوں، چوپاؤں اور کھیتی باڑی وغیرہ کی محبت کو مزین کر دیا گیا ہے یہ وہ چیزیں ہیں جن سے انسان دنیوی زندگی میں فائدہ اٹھاتا ہے۔ واضح رہے کہ بہتر نتائج خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتے ہیں۔

ان چیزوں کی محبت انسان کے دل میں خوش نما بنا کر فطری طور پر ڈال دی گئی ہے اور خدا نے ہی ڈالی ہے۔ اس لیے اسے مطلقاً مذموم اور معیوب قرار نہیں دیا جا سکتا۔ البتہ اس نے اس محبت کی جو حدود مقرر کر دی ہیں۔ انسانوں کو اس سے متجاوز نہیں ہونا چاہئے۔ یعنی ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ان چیزوں کی محبت قطعاً محمود ہے اور اس پر کسی قسم کی باز پرس یا ملامت نہیں کی جا سکتی۔

اولاد انسانی کردار کی کسوٹی ہے:

اولاد تو ایک قسم کی کسوٹی ہے جس سے بڑی آسانی کے ساتھ یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ انسان کا اپنا کردار کس حد تک مستحکم ہوا ہے۔ اگر وہ خدائی حدود کے اندر اپنی اولاد سے محبت کرتا ہے تو وہ کوئی برائی نہیں کرتا۔ لیکن اگر اولاد کی محبت کے جذبات اس قدر غالب آ جاتے ہیں کہ وہ اسے حدود شکنی پر مجبور کر دیتے ہیں تو اس سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کا اپنا کردار مستحکم نہیں ہوا اور کردار کی یہ ناپختگی یقیناً قابل گرفت ہوگی۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (8:28)

اسے خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ اجر عظیم خدا کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی مل سکتا ہے۔

فتنۃ کا لفظ عربی زبان میں ابتلاء امتحان، آزمائش وغیرہ کے لیے آتا ہے۔ یہ لفظ فتن سے ماخوذ ہے جس کے معنی سونے چاندی کو آگ پر اس مقصد سے پگھلانے کے ہوتے ہیں کہ کھوٹ الگ ہو جائے اور خالص سونا اور چاندی الگ ہو جائے۔ لہٰذا فتنہ کے اس مفہوم کو ذہن میں رکھئے اور ''فتنہ'' کے اُس مفہوم سے دھوکہ نہ کھایئے جو ہمارے ہاں اردو میں عام طور پر سمجھا جاتا ہے۔ بدقسمتی سے اس آیت کو ہمارے ہاں عموماً مال اور اولاد کی مذمت کے لیے بطور شہادت کے پیش کیا جاتا ہے۔ فتنہ کا وہ مفہوم جو ہمارے ہاں اردو میں مروج ہے وہ عربی کا مفہوم نہیں ہے۔ آیت کا واضح مطلب یہی ہے کہ یہ اموال اور اولاد تمہارے کھرے اور کھوٹے کی پہچان کا ایک ذریعہ ہیں۔ جو لوگ اقدار وحی پر مکمل ایمان رکھتے ہیں اور حدودِ الٰہیہ کے اندر اپنی زندگی اور اس کے

تقاضوں کو محدود رکھتے ہیں ان کو اموال واولاد کے ذریعے سے ایسے لوگوں سے ممتاز کر کے الگ کرلیا جاسکتا ہے جو اقدار وحی پر مکمل ایمان نہیں رکھتے، اور حدودِ الٰہیہ کے تابع اپنی زندگی بسر نہیں کرتے۔ خدا کی مقرر کردہ حدود اور اولاد واموال کی محبت میں جہاں تصادم ہوگا وہیں انسان کے اپنے کردار کی پرکھ ہوجائے گی۔ اگر اس تصادم کی صورت میں بھی وہ حدود اور اقدارِ وحی کی پاس داری کرتا ہے۔ تو یہ اس بات کی شہادت ہوگی کہ وہ ان حدود اور اقدار پر صحیح اور مکمل ایمان رکھتا ہے اور اگر وہ اولاد اور اموال کی محبت کی طرف جھک جاتا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ ابھی اس کو خدا کی حدود اور اقدار پر مکمل ایمان حاصل نہیں ہوسکا۔

اولاد کی محبت قانونِ خداوندی پر غالب نہ آجائے:

سطورِ بالا میں آپ نے دیکھ لیا کہ اولاد کی محبت ایک فطری جذبہ ہے جو معیوب یا مذموم نہیں مگر اس کی کچھ حدود ہیں۔ سب سے بڑی حد تو یہ ہے کہ اولاد کی محبت کو قانونِ خداوندی پر غالب نہ آجانا چاہئے۔ جہاں قانون خداوندی اور اولاد کی محبت میں ٹکراؤ اور تصادم کی نوبت آجائے۔ وہاں ہمیں ہمیشہ اولاد کی طرف نہیں بلکہ قانونِ خداوندی کی طرف ہی جھکنا چاہئے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُلْهِكُمْ اَمْوَالُكُمْ وَلَآ اَوْلَادُكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝ (63:9)

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! تمہارے اموال اور تمہاری اولادیں تمہیں خدا کے قانون کی پاسداری سے غافل نہ کردیں۔ جو لوگ ایسا کریں گے وہ یقیناً نقصان اٹھانے والے ہوں گے۔

اگر اولاد کی محبت قانونِ خداوندی کی اطاعت میں حائل اور خارج ہوجاتی ہے تو یہ محبت اپنی حدود سے آگے بڑھ رہی ہے اور اس لیے مذموم ہوجائے گی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّ مِنْ اَزْوَاجِكُمْ وَاَوْلَادِكُمْ عَدُوًّا لَّكُمْ فَاحْذَرُوْهُمْ ۚ وَاِنْ تَعْفُوْا وَتَصْفَحُوْا وَتَغْفِرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ ۭ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝ (64:14-15)

اے پیروانِ دعوتِ ایمان! تمہاری بعض بیویاں اور تمہاری بعض اولادیں تمہارے لیے دشمن ہوجاتی ہیں۔ ان سے بچتے رہو۔ اگر تم عفو ودرگذر اور فردگذاشت سے کام لو تو یقیناً خدا بڑا ہی فروگذاشت کرنے والا اور مہربان ہے۔ یاد رہے تمہارے یہ اموال اور اولاد تمہاری آزمائش کی کسوٹی ہیں اور اللہ کے قانون کے مطابق عمل کرنے سے ہی اجرِ عظیم مل سکتا ہے۔

ایسی اولاد جو تمہیں حدودِ خداوندی سے تجاوز پر مجبور کردے اور جس کی وجہ سے تم اقدار خداوندی سے ہم آہنگ نہ رہ سکو تمہارے لیے باعث رحمت نہیں بلکہ موجبِ زحمت ہے۔ وہ تمہاری دوست اور خیرخواہ نہیں بلکہ تمہاری دشمن ہے۔ یہی موقعہ ہے جہاں تمہاری سخت آزمائش ہوتی ہے کہ ایسے موقعہ پر تم قانون خداوندی کی پیروی کو ترجیح دیتے ہو یا جذباتِ محبت کی رو میں بہہ جاتے ہو۔

(جاری ہے)

خصوصی اپیل

(بے مثال تفسیرِ قرآن کی نشر و اشاعت کے لئے تعاون کی درخواست)

غلام احمد پرویز علیہ الرحمۃ نے ساری عُمر قرآن کریم کی تحقیق، تعلیم اور ترویج کرنے میں بسر کی۔ اُنہوں نے خالص قرآن کی مدد سے عصرِ حاضر کے علمی، تحقیقی، سائنسی اور تنقیدی اصولوں کی پاسداری کرتے ہوئے قرآن کے اصلی پیغام الحق کو ہم تک پہنچانے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ پینتیس سال کے لگ بھگ ہفتے کے ہر جمعہ/ اتوار کو باقاعدگی سے درسِ قرآن دیا کرتے تھے۔ اُن کے دروس آڈیو/ وڈیو میں منتقل کئے جاتے تھے جن میں پورے قرآن کا بڑی تفصیل سے لگ بھگ ایک ہزار گھنٹے پر محیط جائزہ لیا گیا ہے۔ بعد میں انہی ٹیپ کی مدد سے اِن دروس کو ٹائپ کر کے مطالب القرآن فی دروس الفرقان کے نام سے کتابی شکل میں 41 ضخیم جلدوں میں شائع کر دیا گیا ہے۔ **ادارہ طلوع اسلام** نے اِسے تبلیغ کا فریضہ خُداوندی سمجھتے ہوئے نبھایا ہے اور احباب سے اپیل کرتا ہے کہ وہ اِن کُتب کو ادارہ سے خرید کر زیادہ سے زیادہ لوگوں اور اداروں تک اپنا تبلیغی فرض سمجھتے ہوئے پہنچائیں۔ اِس عمل میں اگر آپ ادارہ کو مطلوبہ افراد کی فہرست فراہم کر دیں گے تو وہ اس تفسیر قرآنی کا ایک سیٹ آپ کی جانب سے آپ کے دئے ہوئے پتہ پر بجھوا دے گا۔ تعلیمی اداروں میں خصوصی طور پر تعلیمی درسگاہیں اور پبلک لائبریریاں زیادہ اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ادارہ کے پاس اِن کی فہرست موجود ہے جو ضرورت پڑنے پر مہیا کی جاسکتی ہے۔ آپ کو اِس امر سے یہ بھی تسلی رہے گی کہ آپ نے نہ صِرف اپنی طرف سے تبلیغ کا فریضہ ادا کرتے ہوئے اللہ کے کام میں رفاقت کی سعادت حاصل کی ہے بلکہ ادارے کی بھی اِس فریضہ کی ادائیگی کو جاری رکھنے میں بھرپور مدد فراہم کی ہے۔

(41) اکتالیس ضخیم جلدوں پر مشتمل اِس منفرد تفسیر کا ہدیہ مبلغ 19000 روپے ہے۔ اگر آپ یہ تفسیر کسی لائبریری یا دوست کو گفٹ کرنا چاہتے ہیں تو ادارہ کو صرف -/15000 روپے ارسال کر دیجئے۔ ادارہ آپ کی جانب سے یہ تفسیر قرآن مطلوبہ لائبریری یا فرد تک بھجوا دے گا۔ عطیات کے لئے ادارہ کا اکاؤنٹ نمبر درج ذیل ہے۔ ہماری دلی تمنا یہ ہے کہ دروس القرآن کی یہ اکتالیس (41) ضخیم جلدوں پر مشتمل قرآنِ کریم کی مکمل تفسیر پاکستان کی ہر یونیورسٹی کی لائبریری کی زینت بنے تا کہ وہاں کے تمام طالب علم قرآنِ کریم کی اس بے مثال تفسیر سے استفادہ کر سکیں۔

اللہ تعالیٰ ہماری معصوم آرزو کو شرف قبولیت بخش دے اور صاحب حیثیت لوگ اس سلسلے میں آگے بڑھیں اور اس کام میں ہماری مدد کریں تا کہ تبلیغ دین کے اس فریضہ سے ہم سب عہدہ برا ہو سکیں۔ شکریہ

Bank Account Idara Tolu-e-Islam

National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulberg Lahore

For Domestic Transactions	For International Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672	IBAN:PK36NBPA0465004073177672
	Swift Code: NBPAPKKAA02L

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	400	500/-	سورہ یٰسٓ	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن، حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۃ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 11

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

صبح سویرے کا سماں ہے کلیم الزماں، حلیمہ بیگم، عالم آرا ڈرائنگ روم میں بیٹھے ناشتا کرنے میں مصروف ہیں اور ساتھ ہی گپ شپ بھی ہو رہی ہے۔ اتنے میں شکیل الزماں اپنا کرکٹ بیٹ ہاتھ میں لئے کمرے میں داخل ہو کر صرف یہ کہنے آئے ہیں کہ وہ کسی اہم مہم پر روانہ ہو رہے ہیں۔ عالم آرا کی رگ شرارت جو پھڑکی تو شکیل الزماں کی طرف دیکھ کر یہ شعر پڑھ دیا

محمل بندھا ہوا جو بغرضِ سفر ہے آج
اے جان قیس تیرا ارادہ کدھر ہے آج

شعر سنتے ہی شکیل الزماں بول اٹھے۔ بھابی جان! شعر موقع و محل سے مطابقت نہیں رکھتا کیوں کہ جان قیس تو آپ ہیں اور آپ کے قیس کورٹ میں گئے ہوئے ہیں۔ دیور بھابی کی نوک جھونک سن کر کلیم الزماں نے کہا کہ کوئی بات نہیں یہ سلپ آف ٹنگ ہے۔ اس پر شکیل الزماں نے احتجاج کرتے ہوئے کہا کہ ابو! میں آپ کے آرگومنٹ کو نہیں مانتا۔ بھابی مجھے اکثر ایسے ہی تنگ کرتی رہتی ہیں۔ کبھی شکیل کی جگہ مجھے یوں کر کے بلاتی ہیں شریر صاحب ذرا ادھر آیئے۔ کلیم الزماں نے شکیل کو سمجھاتے ہوئے کہا کہ بہتر ہے کہ تم اس کو سلپ آف ٹنگ ہی سمجھ لو تو گھر کا موسم خوشگوار رہے گا۔ اسی سلپ آف ٹنگ کی وجہ سے آجکل ہمارے ایک سیاست دان عدالت کے نرغے میں آئے ہوئے ہیں۔ اگر وہ کہہ دیتے کہ کورٹ کا فیصلہ شائستۂ عقل و خرد نہیں تو بات تو وہی ہوتی جو کہی تھی مگر اس پر گرفت نہ ہوتی۔ کلیم الزماں کی بات سن کر حلیمہ بیگم بول اٹھیں۔ کلیم صاحب! آجکل آپ شائستہ کا لفظ کچھ زیادہ ہی استعمال کر رہے ہیں۔ کلیم الزماں نے غور سے اپنی بیگم کی طرف دیکھ کر کہا کہ یہ بھی سلپ آف ٹنگ ہے اور میں ابھی اس کی وجہ بیان کرتا ہوں اور وہ یہ کہ شکیل صاحب کافی بڑی عمر کے ہو گئے ہیں شائستہ لڑکی کیسی رہے گی۔ باپ اور ماں کی باتیں سن کر شکیل الزماں بول اٹھے اور اپنے والد کی طرف دیکھ کر کہا کہ ابو! آپ میری رائے پوچھے بغیر ہی میری زندگی کا فیصلہ کر رہے ہیں۔ شکیل کا احتجاج سن کر عالم آرا نے کہا شکیل صاحب! یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا ہے کہ آپ شریر الزماں سے مسٹر شکیل الزماں بن جائیں اور اس کا طریقہ شاعر نے یہ تجویز کیا ہے کہ

کسی ہو کے رہو اچھی نہیں یہ آزادی
کسی کی زلف سے لازم ہے سلسلہ دل کا

کہیے! اس مرتبہ تو شعر حسب حال ہے اور تیر نشانہ پر آلگا ہے۔ یہ شعر سن کر شکیل الزماں مسکراتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے۔ حلیمہ بیگم نے کلیم صاحب کو دیکھ کر کہا کہ لڑکی کے متعلق کچھ معلومات بھی رکھتے ہیں آپ، جواب میں کلیم صاحب نے کہا کہ ایک شعر ہے اردو زبان جاننے والے اسے اچھی طرح جانتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

شعر کا انتخاب یا کسی کتاب کا انتخاب انسان کی پوری شخصیت کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ تم نے دیکھا نہیں کہ جب نشاط شعر سنا رہی تھی تو اس شعر کو سن کر شائستہ آبدیدہ ہوگئی تھی، مگر ایک شاخِ نہالِ غم جسے دل کہیں سو ہری رہی۔ ایسی لڑکی اس زمانہ میں مشکل سے ملے گی۔ جس دن یہ لوگ آئیں تو پکوڑے توفضل کریم ہی بنائے گا۔ آپ اس کو بتاتی جائیں کہ پکوڑوں کا سائز چھوٹا رکھے، نہ معلوم کتنے لوگ آئیں اور کسی بہانہ سے شائستہ کو بھی مدد کے لئے بلالیں، اس سے گفتگو کرنے کے بعد تمہیں معلوم ہو جائیگا کہ وہ کیسی لڑکی ہے۔ زندگی میں اس کی ترجیحات کیا ہیں وغیرہ وغیرہ اسے بھی آپ کے متعلق معلومات ہو جائیں گی اور آپ دونوں میں تھوڑا بہت انس پیدا ہو جائیگا۔ باقی سب معاملہ عالم آرا پر چھوڑ دو وہ تمہیں پوری پوری معلومات فراہم کردے گی اور یہ بھی ممکن ہے کہ وہ پہلے ہی سے شائستہ کو جانتی ہو۔ اسے بلا کر ابھی پوچھ لو، کسی کام سے وہ شاید باورچی خانے میں گئی ہو۔

یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جب لوگ اپنے بچوں کی شادی کے لئے بے قرار ہوں تو ان کے تحت الشعور میں ایک جذبہ اٹھکیلیاں لینے لگتا ہے اور انہیں اپنی شادی کا زمانہ یاد آنے لگتا ہے۔ لہذا کلیم صاحب کی باتیں سن حلیمہ بیگم نے کہا کہ آج آپ اپنی ہونے والی بہو کی ترجیحات معلوم کرنا چاہتے ہیں۔ ہمیں تو آپ نے یہ نہیں پوچھا تھا کہ تمہاری ترجیحات کیا ہیں؟ حلیمہ بیگم کی بات سن کر کلیم صاحب نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ڈارلنگ تمہارا حافظہ کمزور ہے، یاد کرو شادی سے پہلے جب ایک دن آپ چھت پر کھڑی اپنی زلفوں کو خشک کر رہی تھیں اور بار بار چاروں طرف دیکھ کر ہماری طرف دیکھتی تھیں تو ہم معاملہ سمجھ گئے اور حمید لکھنوی کا یہ شعر دل میں پڑھتے ہوئے

ارے توبہ ہر ہر نظر کی بلاغت
وہ جب ہر طرف دیکھ کر دیکھتے ہیں

تو ہمیں جرأت ہوئی اپنا حال دل اپنی پتنگ پر لکھ کر آپ کے گھر کی چھت پر گرادیں۔ یاد ہے کچھ! اگر یاد نہیں تو یاد کرادوں۔ حلیمہ اپنے حافظہ پر زور دے رہی تھی کہ کلیم صاحب نے کہا کہ اس پتنگ پر لکھا تھا کہ

طائر دل تیری زلفوں سے نہ چھوٹا تا حیات
دوش پر صیاد کے وہ کس بلا کا دام تھا

شعر سنتے ہی حلیمہ بیگم پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہوگئی جسے دیکھ کر کلیم صاحب نے کہا کہ وہ دن بھی یاد کرو جب ہم لارنس گارڈن میں شادی کے ایک دو ہفتہ کے بعد سیر کرنے گئے تھے تو ہوا سے تمہارے بال اڑ رہے تھے اور تم

انہیں بار بار سنبھال رہی تھیں۔ تو میں نے کیا کہا تھا؟ یاد ہے کچھ! یاد کرادوں، کہا تھا۔

ذرا لہرانے دو رخ پر یونہی زلفِ پریشاں کو
بدلتا ہے بدلنے دو نظامِ بزمِ امکاں کو

عین اسی وقت عالم آرا دروازے پر نمودار ہوئی تو حلیمہ بیگم نے بات بناتے ہوئے کہا، آپ پکوڑوں کا ذکر کر رہے ہیں، پنیر تو ہے ہی نہیں معلوم نہیں آئے یا نہ آئے۔ حلیمہ بیگم کی بات سن کر کلیم صاحب نے بھی گھبرائی ہوئی آواز میں کہا ہاں پنیر تو ابھی آیا ہی نہیں لیکن آجائے گا۔ عالم آرا موقع بھانپ کر سمجھ گئی اور مسکراتی ہوئی واپس چلی گئی۔ جب دونوں بزرگوں کے حواس درست ہوئے تو حلیمہ بیگم نے بڑی متانت سے کہا کہ کلیم صاحب اگر پنیر نہ پہنچا تو بڑی ہیٹی ہو جائے گی۔ اس پر کلیم الزماں بولے حلیمہ صاحبہ آپ خواہ مخواہ پریشان ہو رہی ہیں۔ صدیقی صاحب نے جس شخص کے سپرد یہ کام کیا ہے وہ ان کا نواسہ ہے۔ وہ پیار سے اسے نومی کہہ کر بلاتے ہیں۔ اس کے متعلق میں صرف یہ کہہ سکتا ہوں کہ لفظ ڈیپنڈ ایبل اس کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو ہے اور وہ خود بھی پنیر کے پکوڑے کھانے کا شوق رکھتا ہے، فکر نہ کرو پنیر پہنچ جائے گا۔ ہاں! خیال رکھنا پکوڑے چھوٹے چھوٹے ہوں، معلوم نہیں کتنے لوگ آجائیں۔ میں نے صلائے عام دے کر شاید غلطی کر دی ہے۔ بہر حال اگر زیادہ لوگ آ گئے تو عالم آرا کے ساتھ شائستہ کو بھی مدد کے لئے باورچی خانہ میں بلا لینا۔ فضل کریم پر بات نہیں چھوڑی جا سکتی۔ کلیم الزماں کی بات سن کر حلیمہ بیگم بھنّا گئیں کیونکہ انہیں محسوس ہوا کہ کلیم الزماں صاحب ان کی انتظامی صلاحیتوں پر اعتماد نہیں کرتے چنانچہ بڑے غصے کی حالت میں انہوں نے کلیم الزماں کو سرزنش کے طور پر کہا کہ آپ نے ہر وقت شائستہ شائستہ کی رٹ لگا رکھی ہے، آپ نے اس لڑکی کا حدود اربعہ بھی معلوم کیا ہے؟ بیگم صاحبہ کی بات سن کر کلیم الزماں نے انہیں یقین دلاتے ہوئے کہا کہ وہ عالم آرا کے ذریعے سب کچھ معلوم کر چکے ہیں۔ ان کی معلومات کے مطابق شائستہ کی رگوں میں بھی وہی دہلوی خون ہے جو بیگم صاحبہ کے جسم میں حرکت کر رہا ہے۔ اردو سپیکنگ گھرانہ ہے، شائستہ کے والد فوت ہو چکے ہیں۔ ایک بھائی شادی شدہ ہے اور وہ امریکہ میں ہے۔ شائستہ اپنے چھوٹے بھائی اور والدہ کے ساتھ ایک معقول مکان میں رہتی ہیں۔ یہ تفصیل سن کر بیگم صاحبہ نے بڑے متجسسانہ انداز میں پوچھا کہ شائستہ کی والدہ صاحبہ کی عمر کیا ہوگی، خوبصورت بھی ہونگی؟ اپنی بیگم کا انداز گفتگو دیکھ کر کلیم الزماں غصے کی حالت میں یہ کہتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئے کہ، حلیمہ بیگم صاحبہ! اگر تمہیں حلیم پکانا اچھا لگتا ہے تو کم از کم یہ خیال ضرور کرو کہ اس میں مرچیں زیادہ نہ ہوں، تاکہ کام و دہن کی آزمائش سے واسطہ نہ پڑے۔

توجہ فرمائیے

ادارہ طلوعِ اسلام لاہور اکتوبر کے چوتھے ہفتے میں سالانہ کنونشن کا انعقاد کر رہا ہے۔ احباب سے گذارش ہے کہ اپنے اپنے علاقہ کی بزم ہائے طلوعِ اسلام سے رابطہ کر لیں۔ (چیئرمین ادارہ)

ڈاکٹر عبدالودود

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عالمِ افلاک اور قرآنِ عظیم

(ماخوذ ماہنامہ طلوعِ اسلام، مارچ 1980ء)

طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت فروری 1980ء میں، ڈاکٹر سید عبدالودود صاحب کا مختصر سا مقالہ بعنوان، سائنٹفک تحقیق اور اجتہاد شریکِ اشاعت کرتے وقت ہمارے ذہن میں یہ خیال ابھرا تھا کہ نا معلوم ہمارے حلقۂ قارئین میں کس حد تک احباب اس قسم کے سائنٹفک مقالات سے مستفید ہوں گے اور انہیں پسند کریں گے۔ مقالہ کی اشاعت کے بعد، جو ردِعمل ہم تک پہنچا اس سے ہمیں بڑی خوشی ہوئی کہ اس حلقہ میں اہلِ نظر احباب کی کمی نہیں۔ اس سے ہمارا حوصلہ بڑھا اور ہم نے ڈاکٹر صاحب موصوف کی خدمت میں گزارش کیا کہ وہ اس سلسلہ کو جاری رکھیں۔ پیشِ نظر مقالہ ہماری اسی استدعا کے جواب میں ہے جس کے لئے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ہمیں اُمید ہے کہ قارئین ان مقالات کا اسی گہرے غور وتدبر سے مطالعہ کریں گے جس کے یہ مستحق ہیں۔ اس قسم کے سائنٹفک مقالات میں انگریزی اصطلاحات ناگزیر ہیں اور چونکہ ابھی تک ہمارے ہاں ان کے مرادفات اردو زبان میں مروج نہیں، اس لئے انہیں مجبوراً انگریزی زبان میں درج کر دیا جاتا ہے۔ اس کے لئے ہم قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہیں۔

(طلوعِ اسلام)

میری کتاب (Phenomena of Nature and The Quran) نومبر 1971ء میں شائع ہوئی تھی گاہے بگاہے اس کتاب کی تعریف تو مختلف گوشوں کی طرف سے ہوتی رہی لیکن اس پر تنقید کسی طرف سے نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ کہ میں اس موضوع کی طرف سے کسی حد تک غافل ہوتا گیا۔ اب کئی برسوں کے بعد استادِ محترم جناب پرویز نے دو نئی کتابیں یکے بعد دیگرے بھجوا کر مجھے خوابِ غفلت سے بیدار کیا۔ یہ کتابیں بھی اسی یعنی ''مظاہر فطرت اور قرآن'' پر ہیں۔ ایک کا نام ہے (The Bible, The Quran, and Science) اور مصنف ہیں (Dr. Maurice Bucaille)، دوسری کتاب

ہے۔ (Glimpses of the Scientific Unattainable Marvels of the Quran) مصنف ہیں (Dr. M.A. Al Ghamravi) اور مترجم (Dr. A.A.S Alkirdani) ۔ان دونوں کتابوں نے مجھے کائنات کے متعلق آیاتِ قرآنی پر مزید غور وفکر کا موقع بہم پہنچایا۔ چنانچہ میں نے ارادہ کیا کہ جو نکات ان کتابوں میں میرے سامنے آئے ہیں ان پر تبصرہ کرکے، محترم پرویزؒ صاحب کی خدمت میں پیش کرتا جاؤں تا کہ طلوعِ اسلام میں اس کی اشاعت سے دیگر اصحاب بھی مستفید ہوسکیں اور جہاں مناسب سمجھیں مجھے مشورہ بھی دے سکیں۔ یعنی قارئین میں سے اگر کوئی صاحب یہ سمجھتے ہوں کہ کسی مقام پر میری سوچ غلط ہے تو اس کی تصحیح فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔ میں پہلے مرحوم ڈاکٹر محمد الغمر اوی کی کتاب (جس کا انگریزی ترجمہ 1977ء میں قاہرہ سے شائع ہوا) کی طرف متوجہ ہوتا ہوں۔ اس کتاب کے تقریباً تمام نکات فلکیات (Astronomy) سے متعلق ہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس سے ہر غواص کو اس کی علمی وسعت کے مطابق کوئی نہ کوئی نیا گوہر مل جاتا ہے۔ چنانچہ اس کتاب کے نکات پیش کرتا ہوں۔

پہلا نکتہ ہے ___ ''اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ'' (1:1) کے لفظ عالمین سے متعلق۔

بیان کیا گیا ہے ___ عالمین کا لفظ عالم کی جمع ہے۔ عام طور پر اس سے مراد انسانوں کی دُنیا۔ جنوں کی دُنیا فرشتوں کی دُنیا۔ حیوانات کی دُنیا۔ پودوں کی دُنیا وغیرہ لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں۔ عالمین سے مراد افلا کی کائناتیں (Astronomical Worlds) یعنی ہماری دنیا کی مثل دیگر کائناتی دُنیائیں ہے۔ اس کے ثبوت میں مصنف نے قرآن کریم کی آیات (41:9، 41:10، 41:11، 41:12) پیش کی ہیں۔ یعنی

(1) قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا ؕ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ ۚ﴿۹﴾ (41:9)

ان سے پوچھو کہ کیا تم اس خدا سے انکار کرتے ہو جس نے زمین کو دو ایام میں پیدا کیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو جو رب العالمین ہے۔

(2) وَجَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَاۤ اَقْوَاتَهَا فِیْۤ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ ؕ سَوَآءً لِّلسَّآىِٕلِیْنَ ﴿۱۰﴾ (41:10)

اور اس نے زمین پر اس کی سطح کے اوپر پہاڑ بنا دیئے او رمختلف اشیاء میں برکت (استحکام، کثرت، ثبات، اور نشوونما کی صلاحیت) پیدا کردی اور اس میں غذائیت بہم پہنچانے کے پیمانے مقرر کردیئے۔ چار ایام میں۔ ہر ضرورت مند کے لئے برابر برابر۔

(3) ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ قَالَتَاۤ اَتَیْنَا طَآىِٕعِیْنَ (41:11)

پھر (خدا) آسمان کی طرف متوجہ ہوا اور وہ دھواں تھا اور ہم نے اس کو اور زمین کو کہا کہ تم ایک دوسرے کے قریب ہوجاؤ، رضا سے یا عدمِ رضا سے۔ انہوں نے کہا ہم بطیبِ خاطر ایک دوسرے کے قریب آتے ہیں۔

(4) فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ؕ وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖۚ وَحِفْظًا ؕ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ (41:12)

پس دو ایام میں سات آسمان بنا دیئے اور ہر آسمان نے جس قانون کے مطابق چلنا تھا، اس کی وحی اس کی طرف کر دی۔ اور ہم نے سماء الدنیا کو چراغوں سے آراستہ کیا اور اس کے اندر سامانِ حفاظت رکھ دیا۔ یہ سب اس کے پیمانے ہیں جس کی قوت اور جس کا علم لامحدود ہیں۔

استدلال: مصنف نے مندرجہ بالا آیات سے عالمین کے معنی ''افلاکی کائناتیں'' ثابت کرنے کے لئے مندرجہ ذیل استدلال پیش کیا ہے۔

1۔ آیت (41:9) میں یومَین (دو ایام) کا ذکر، زمین کی مادی تخلیق سے متعلق ہے۔

2۔ آیت (41:11) میں کہا گیا ہے کہ جب زمین کی تخلیق مکمل ہوگئی تو آسمان ابھی تک دخان (دھواں) تھا اور سات آسمانوں کی تخلیق ابھی تک نہیں ہوئی تھی۔ یہ، اس کے بعد، (یومین) دو ایام، میں مکمل ہوئی۔ گویا سات آسمانوں کی تخلیق سے پہلے صرف ایک زمین تھی اور ایک ہی آسمان تھا جو دھوئیں کی شکل میں تھا۔

3۔ آیت (41:11) میں آسمان اور زمین سے جو کہا گیا ہے کہ ''باہمی رضامندی سے ایک دوسرے کے قریب آجاؤ'' تو کیا اس سے وہی زمین مراد ہے جس پر ہم رہتے ہیں؟ اس کا جواب نفی میں ہے، کیونکہ ہماری زمین اس سے پہلے معرضِ وجود میں آچکی تھی۔ اس پر پہاڑ بھی بن چکے تھے اور زندگی کی نمود بھی ہو چکی تھی۔ آیت (41:11) میں ثُمَّ کا لفظ (Sequence) ترتیب کے لئے ہے۔ گویا ہماری زمین (بمع زندگی کی نمود) کی تخلیق کے بعد ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ کہا گیا۔ چنانچہ وہ زمین جسے یہ حکم ملا ہماری زمین سے مختلف تھی۔ آیت (41:9) میں لِلْاَرْضِ کا لفظ ہماری زمین کی طرف اشارہ کرتا ہے اور آیت (41:11) میں لِلْاَرْضِ کا لفظ ہماری زمین سے الگ جملہ کائناتی زمینوں کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

4۔ کائنات میں جتنی زمینیں ہیں اتنے ہی آسمان ہیں۔ ''اَللّٰهُ الَّذِيْ خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ وَّمِنَ الْاَرْضِ مِثْلَهُنَّ ؕ'' میں ان سات آسمانوں اور زمینوں کا ذکر ہے جو ہماری زمین کی تخلیق کے بعد معرضِ وجود میں آئے۔ چنانچہ کائنات میں سات آسمان اور سات زمینیں ہیں، اور ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ کا ذکر باقی چھ زمینوں کے متعلق ہے۔

5۔ اَوَلَمْ يَرَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ ۔۔۔ (21:30) کیا کافروں کو معلوم نہیں کہ سمٰوات اور ارض آپس میں جڑے ہوئے تھے اور پھر ہم نے ان کو الگ الگ کر دیا۔

مصنف نے کہا ہے کہ یہ اس وقت کا ذکر ہے جب سمٰوات اور ارض کا وجود نہیں تھا اور ساری کائنات دخان کی شکل میں تھی۔ لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یوم اوّل وہ تھا جب زمین سورج سے الگ ہوئی۔ یوم دوئم وہ تھا جب زمین ٹھنڈی ہو کر سخت ہوگئی۔ یوم سوئم وہ تھا جب زمین پر پہاڑ بن گئے (یوم چہارم کا کوئی ذکر نہیں)۔

6۔ آیت (41:9) کے (یومین) دو ایام، آیت

(41:10) کے (اربعۃ ایام) چار ایام میں شامل ہیں۔

تبصرہ:

مندرجہ بالا استدلال کو پڑھ کر میرے ذہن میں یہ تاثر پیدا ہوا کہ مصنف آیاتِ مذکورہ، یعنی (41:9-12) کی تہہ تک نہیں پہنچ سکا اور اس نے ان سے جو نتائج اخذ کئے ہیں وہ صحیح نہیں۔ جہاں تک متعدد افلا کی زمینوں کا تعلق ہے ان کا وجود از روئے سائنس ممکنات میں سے ہے، اور اس کی تائید میں آیاتِ قرآن بھی موجود ہیں۔ لیکن جن آیات سے مصنف نے ان کا وجود ثابت کرنے کی کوشش کی ہے ان سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ سب سے پہلے مصنف نے عالمین اور زمینوں کو ہم معنی قرار دیا ہے۔ عالم کا مادہ ہے (ع ل م)۔ عالم وہ شے ہے جس کے ذریعے کسی چیز کا علم ہو سکے۔ چونکہ خدا کا علم کائنات کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اس لئے کائنات عالم کہلائی جاتی ہے۔ اور کائنات کے مختلف پہلوؤں اور گوشوں کو بھی عالم کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے عالم کا لفظ نسل یا قوم کے لئے بھی استعمال کیا ہے چنانچہ بنی اسرائیل کے متعلق کہا گیا: اَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ (2:47) ہم نے تمہیں اقوامِ عالم پر فضیلت دی۔ بنا بریں میں نہیں سمجھ سکا کہ آیت اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ (1:1) سے مراد افلا کی دنیائیں کہاں تک درست ہو سکتا ہے؟

اب آیئے ان آیات کی طرف جن کی رُو سے عالمین کے معنی ''افلا کی دنیائیں'' لئے گئے ہیں۔ یعنی (41:9-12) یہ درست ہے کہ آیت (41:9) میں یومین سے مراد وہ دو ''ایام'' (مراحل) ہیں جن میں زمین کی مادی تخلیق ہوئی اور آیت (41:10) زمین پر زندگی کی نمود سے متعلق ہے۔ لیکن یہ کہنا بالبداہت غلط ہے کہ پہلی آیت کے ''یومین'' دوسری آیت کے ''اَربعۃ ایام'' میں شامل ہیں۔ چونکہ آیت (41:12) میں بھی یومین کا ذکر ہے اس لئے مصنف نے ان دو ایام کو (41:10) کے اربعۃ ایام میں شامل کر کے (ستۃ ایام) چھ ایام بنا دیا۔ اب اگر (41:9) کے یومین کو بھی اس میں شامل کیا جائے تو اس سے کائنات کی تخلیق کے آٹھ ایام بنتے ہیں۔ اس مشکل سے بچنے کے لئے مصنف نے (41:9) کے یومین کو (41:10) کے اربعۃ ایام میں شامل کر کے ان کا حصہ بنا دیا۔

ڈاکٹر (Maurice Bucaille) نے اپنی کتاب میں اس کا ذکر کیا ہے اور کہا ہے یہ اعتراض اٹھایا بھی جا چکا ہے کہ قرآن کی رو سے کائنات کی تخلیق کے آٹھ ایام بنتے ہیں، اور اس کے باوجود قرآن ستۃ ایام (چھ ایام) کا ذکر کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ (41:9) کے یومین اور (41:12) کے یومین ایک ہی ہیں۔ مصنف کے غلط استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ اس نے (41:11) میں لفظ (ثُمَّ) کو (Sequence) ترتیب کے معنوں میں لے لیا اور اسی بنا پر کہہ دیا کہ پہلے ہماری زمین بنی اس کی مادی تخلیق اور زندگی کی نمود کے بعد تک، ایک ہی آسمان تھا جو دخان کی شکل میں تھا۔ پھر اس کے بعد سات آسمانوں کی تخلیق ہوئی اور ہماری زمین کے علاوہ چھ اور زمینیں بنیں۔ آیت (21:30) میں کہا گیا ہے کہ پہلے سمٰوات وارض آپس میں جڑے ہوئے تھے۔ پھر ان کو الگ الگ کر دیا گیا۔ مصنف نے خود اس کا ذکر کیا ہے کہ یہ اس وقت کی طرف اشارہ ہے جب پوری

کائنات دخان کی شکل میں تھی اور پھر اس کے الگ الگ ٹکڑے ہوگئے۔ سائنس کی رو سے یہ وہ ٹکڑے تھے جن سے بعد میں (Galaxies) بنیں۔ ان ٹکڑوں میں انجماد کی صورت پیدا ہوئی۔ انجماد کی صورت میں مختلف مقامات پر (Gravity) پیدا ہوئی جس کے بعد یہ الگ الگ ٹھوس کرے بن گئے۔ لیکن مصنف کی یہ دلیل کس قدر تاسف انگیز ہے کہ پوری کائنات میں صرف ایک ہی نقطہ پر انجماد کی صورت پیدا ہوئی جس سے ہماری زمین بن گئی۔ پھر اس پر جاندار مخلوق پیدا ہوئی۔ اور ان اربوں سالوں میں باقی ساری کائنات دخان کی شکل میں رہی۔ اور پھر جب (مصنف کے نقطۂ نظر سے) سات آسمان اور چھ زمینیں بنی تو ان کو حکم ملا ''اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا ط''۔ یاد رہے کہ سائنس کی تحقیق کی رو سے زمین کی مادی تخلیق میں (3000) ملین یعنی 3 ارب سال لگے تھے جس کے بعد اس پر زندگی کی نمود ہوئی۔ اور زندگی کے ارتقاء میں اس وقت تک 2 ارب سال لگے۔ دخان کا لفظ جامع ہے۔ دھوئیں میں صرف گیس نہیں ہوتی۔ ٹھوس ذرات بھی ہوتے ہیں۔ او رپوری کائنات میں طبیعی حالات ایک ہی جیسے تھے۔ پھر یہ کیسے ہوا کہ اتنی بڑی وسعت میں، جس کے فاصلے (Light Years) میں ناپے جاتے ہیں صرف ایک ہی نقطہ پر دخان نے ٹھوس شکل اختیار کی اور باقی ساری کائنات اس طویل عرصے میں دخان ہی رہی۔ قرآن کہتا ہے کہ کائنات میں دوسرے کرّوں پر بھی زندگی موجود ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ ان مقامات پر جہاں یہ کرّے ہیں وہاں بھی ابتداء میں طبیعی حالات ہماری زمین جیسے تھے اور جہاں جہاں زندگی موجود ہے وہاں دخان سے ٹھوس شکل اختیار کرنے کا عمل کم وبیش ایک ہی وقت میں شروع ہوا۔ ورنہ، بصورت دیگر، ہماری زمین پر زندگی کی نمود کے بعد، دیگر مقامات پر انجماد کا عمل شروع ہونا۔ پھر وہاں کرّوں کا ٹھوس شکل اختیار کرنا۔ پھر وہاں زندگی کی نمود کا وقوع پذیر ہونا، اس قدر قلیل مدت میں کیسے ممکن ہوا؟

ثُمَّ:

حقیقت یہ ہے کہ لفظ (Sequence) ترتیب کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور (Juxtaposition) کے لئے بھی۔ یعنی ایک سے زائد واقعات بیک وقت بیان ہو رہے ہوں تو بھی (ثُمَّ) کا لفظ آتا ہے، جس طرح انگریزی کا لفظ (More : Over) ہے۔ مثلاً سورۂ یونس میں ہے: ثُمَّ اللّٰہُ شَھِیْدٌ عَلٰی مَا یَفْعَلُوْنَ (10:46) ''اور اللہ اس پر گواہ ہے جو یہ لوگ کرتے ہیں۔'' یہاں ثُمَّ (اور) کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اسی طرح آیت (41:11) میں بھی (ثُمَّ) کا لفظ (Sequence) کے بجائے (Juxtaposition) کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ اس آیت میں یہ لفظ ترتیب کے لئے آیا ہے تو پھر غیر مسلموں کا یہ اعتراض حق بجانب ہوگا کہ ان آیات میں سِتَّۃَ اَیَّامٍ کی بجائے آٹھ ایام کیوں پائے جاتے ہیں؟

قرآن کریم میں جن مقامات پر ارض وسمٰوات کے الفاظ آئے ہیں ان کے بیان میں بھی کوئی ترتیب نہیں پائی جاتی۔ بیشتر آیات میں سمٰوات کا لفظ پہلے آتا ہے اور ارض کا بعد میں مثلاً آیات (7:54، 10:3، 11:7، 25:59، 32:4، 78:7، 50:38، 57:4، 33-27:29 اور

10-91:5) میں۔ صرف چند ایک آیات میں ارض کا لفظ پہلے آتا ہے۔ مثلاً (20:4) اور (2:29) میں۔ البتہ ایک مقام ایسا آتا ہے جہاں تخلیقِ کائنات کے سلسلہ میں (Sequence) ترتیب کا پہلو نمایاں ہے۔ ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰىهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا ﴿۳۰﴾ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰىهَا ﴿۳۱﴾ وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا ﴿۳۲﴾ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ﴿۳۳﴾ (79:27-33)

''کیا تمہاری تخلیق زیادہ مشکل ہے یا آسمان کی جسے (اللہ) نے بنایا۔ اس کی چھت کو بلند کیا۔ اور اس میں اعتدال وتوازن پیدا کیا۔ اس کی رات کو تاریک بنایا اور اس سے روشنی نکالی۔ اور (بَعْدَ ذٰلِكَ) پھر اس کے بعد زمین کو بچھایا اور اس میں سے پانی اور چارہ نکالا۔'' میں اس آیت سے متعلق اپنے بیان کو سرِ دست یہیں تک محدود رکھتا ہوں کہ اس میں کائناتی واقعات کو ایک (Sequence) میں بیان کیا گیا ہے۔ یعنی پہلے کیا ہوا اور بعد میں کیا ہوا۔ اس کی مزید وضاحت دوسرے موقع پر کروں گا۔ اوّل اس لئے کہ لفظ ''دَحٰىهَا'' کے متعلق میرے ذہن میں ایک الجھن موجود ہے جو ابھی دور نہیں ہوئی۔ دوئم اس لئے کہ ''وَالْجِبَالَ اَرْسٰىهَا'' کا مفہوم سائنس کی رو سے تفصیل کا متقاضی ہے۔

سَبْعَ سَمٰوٰتٍ:

مصنف نے سات آسمانوں اور سات زمینوں کا جو ذکر کیا ہے اس میں بھی الجھاؤ موجود ہے۔ فی زمانا اکثر مفسرین اس سے متفق ہیں کہ سات کا لفظ تعدد (Plurality) کو ظاہر کرتا ہے۔ اس سے سات کا عدد مراد نہیں۔ یعنی یہ لفظ ''متعدد'' کے معنی میں استعمال ہوا۔ جہاں تک سائنس کے انکشافات کا تعلق ہے ان کی رو سے تا حال سات آسمانوں کو متعین کرنا ممکن نہیں۔ اس مقام پر میں، لغات القرآن سے اقتباس پیش کرتا ہوں جس میں محترم پرویز صاحب نے قرآن کے لفظ سَبْعَ کو، حسب دستور اپنے مخصوص اور دلچسپ انداز میں قرآن ہی کے الفاظ سے واضح کیا ہے۔ انہوں نے اس میں کہا ''لین نے بیضاوی کے حوالے سے لکھا ہے کہ عربوں کے ہاں سبعۃ سات کو ہی نہیں کہتے بلکہ وہ ان معنوں میں بھی بیان کرتے ہیں جن معنوں میں ہم کہتے ہیں ''کئی ایک'' یا متعدد جیسے ہماری زبان میں بیسیوں یا سینکڑوں کے الفاظ بولے جاتے ہیں جس سے مراد کوئی متعین عدد نہیں ہوتا۔ یا جیسے ہم کہتے ہیں 'تمہیں سو بار سمجھا چکا ہوں' اس سے مراد ٹھیک سو کی تعداد نہیں ہوتی۔ قرآن کریم میں ہے۔ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً (9:80) اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر تو ان کے لئے ستر بار مغفرت مانگے تو ہم مغفرت نہیں دیں گے اور اگر ستر سے زیادہ دفعہ مانگے تو دے دیں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تو چاہے ان کے لئے کتنی مرتبہ مغفرت مانگے انہیں مغفرت نہیں مل سکے گی۔ ان معانی کے پیش نظر سَبْعَ سَمٰوٰتٍ کا مفہوم بھی واضح ہو جاتا ہے یعنی ''متعدد اجرامِ فلکی'' ہمارے ہاں یہ بھی کہتے ہیں سات سمندر پار، مندرجہ ذیل آیت سے بھی سبع کے معنی متعدد واضح ہو جاتے ہیں۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ۔۔۔(2:261) ''ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں ایسی ہے جیسے ایک دانہ سات بالیں اُگائے اور ایک بال میں سو سو دانے ہوں۔'' ظاہر ہے کہ یہاں سبع سے مراد متعدد ہے۔'' (لغات القرآن)

چنانچہ جہاں تک آیات (12-41:9) کا تعلق ہے یہ واضح ہے کہ سمٰوات وارض کی مادی تخلیق دو ایام میں معرضِ وجود میں آئی اور زمین پر زندگی کی نمود اربعۃ ایام یعنی چار ایام میں طے پائی (ضمناً عرض کردوں کہ قرآن کے لفظ یوم سے کیا مراد ہے اور ستۃ ایام کیا ہیں، اس کے متعلق ایک پورا باب میری کتاب میں موجود ہے) (41:11) میں جس سماء کا ذکر ہے یہ وہی سماء ہے جسے (41:12) میں سماء الدنیا کہا گیا ہے۔ اور ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ کا حکم ہماری زمین اور ہمارے آسمان (سماء الدنیا) کو ملا تھا۔ اَنَّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ كَانَتَا رَتْقًا فَفَتَقْنٰهُمَا ؕ (21:30) یعنی'' سمٰوات وارض پہلے آپس میں جڑے ہوئے تھے پھر ہم نے انہیں الگ الگ کر دیا۔'' اس کے متعلق مصنف نے درست کہا ہے کہ یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ارض وسمٰوات کا وجود نہیں تھا اور ساری کائنات دخان پر مشتمل تھی۔ لیکن اس سے یہ غلط نتیجہ اخذ کیا ہے کہ یومِ اوّل وہ تھا جب زمین سُورج سے الگ ہوئی۔ یومِ دوئم وہ تھا جب زمین ٹھنڈی ہوگئی اور یوم سوئم وہ تھا جب زمین پر پہاڑ بن گئے، کیونکہ اربعۃ ایام میں زمین کی مادی تخلیق شامل نہیں ہے۔ زمین کا سورج سے الگ ہونا اور ٹھنڈا ہونا، یومین سے متعلق ہے۔

ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ؕ:

آیت (21:30) میں اس بات کا ذکر کہ پہلے سمٰوات وارض آپس میں جڑے ہوئے تھے پھر الگ الگ ہوگئے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ الگ الگ ہوکر ان کا آپس میں کوئی رشتہ باقی نہ رہا اور یہ ایک دوسرے سے بالکل کٹ گئے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے درمیان باہمی ایسا رشتہ قائم رہا جس پر خالق کائنات کے مستقبل کے تخلیقی پروگرام کا انحصار تھا۔

ہماری ارض اور سماء الدنیا کے باہمی رشتہ کا تعلق مندرجہ ذیل آیت سے ظاہر ہے:

هُوَالَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ؕ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ؕ ۔۔۔(57:4) ''وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ ایام میں پیدا کیا اور اس کا مرکزی کنٹرول اپنے ہاتھ میں رکھا۔ جو کچھ زمین سے نکلتا ہے اور جو کچھ اس میں داخل ہوتا ہے۔ جو کچھ فضا کی بلندیوں سے نیچے اترتا ہے اور جو کچھ اوپر چڑھتا ہے وہ ان سب کا علم رکھتا ہے۔''

غور کیجئے کہ زمین کے جملہ ارتقائی مراحل کی بنیاد زمین اور آسمان کا وہی تعلق ہے جس کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔ زمین میں زندگی سے موت اور موت سے زندگی يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ (30:19) کا مسلسل چکر زمین وآسمان کے اسی باہمی تعلق کی وجہ سے ہے۔ زمین کے اندر اور زمین کے اوپر

(Submicroscopic) سطح سے لے کر (Global) سطح تک، ہر شے کا ہر آن تغیر پذیر ہونا زمین و آسمان کے اسی باہمی تعلق کی وجہ سے ہے۔ ارض وسماء کے درمیان ہر وقت لین دین کا سلسلہ جاری ہے۔ مادے کا لین دین زمین اور آسمان کے درمیان اس قدر قلیل ہے کہ اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، لیکن جہاں تک انرجی کا تعلق ہے، اس کا لین دین بہت بڑے سکیل پر ہر وقت جاری رہتا ہے۔ سماء الدنیا کے (Atmosphere) میں خالق کائنات نے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ چھوٹی (Wave Lengthe) کی زہریلی شعائیں، کاسمک ریز، گاما ریز، ایکس ریز اور ایک حد تک الٹرا وائیولیٹ ریز، زمین کی سطح تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اگر ایسا ہوتا تو زمین پر زندگی کا قیام ناممکن ہوجاتا) لیکن روشنی، حرارت اور وائرلیس کی شعاعیں ہر وقت آسمان سے ربّ العالمین کے مقرر کردہ پیمانوں کے مطابق نیچے اترتی رہتی ہیں۔ دوسری سمت میں حرارت کی شعاعیں زمین سے آسمان کی طرف بھی جاتی ہیں۔ اگر یہ معلوم کرنا مطلوب ہو کہ ان شعاعوں سے پہاڑ، دریا، سمندر، ریگستان اور جنگلات، پودے اور جانور، حتّٰی زندگی اور موت۔ کس طرح متاثر ہوتے ہیں تو میری کتاب کے باب نمبر 9 بعنوان (Environment and Nutrition) میں ملاحظہ فرمائیے۔ یہی وہ قوانین فطرت ہیں جن پر عمل کرنے کے لئے زمین و آسمان کو ''اِئْتِیَا طَوْعًا اَوْ کَرْھًا'' کا حکم ملا۔ چنانچہ وہ رضامندی سے ایک دوسرے کے قریب آ گئے کیونکہ مستقبل میں جو واقعات ارض وسماء میں رونما ہونے والے تھے ان کا انحصار انہی قوانین پر عمل اور اسی باہمی میل جول پر تھا۔

سورۂ حٰمٓ کی آیت (41:10) میں بٰرَكَ، قَدَّرَ، اَقْوَاتَهَا کے الفاظ میں بڑے اہم نکات پوشیدہ ہیں۔ جی تو چاہتا تھا کہ میں انہیں اس مقام پر پیش خدمت قارئین کردوں، لیکن چونکہ ان کا تعلق موضوع زیرِ نظر سے نہیں۔ اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں دوسرے وقت پر اٹھا رکھوں۔ یار زندہ صحبت باقی۔

ضمناً لفظ عالمین کے معانی پر غور کرتے ہوئے میں نے سید ابوالاعلیٰ مودودی (مرحوم) کی تفسیر، تفہیم القرآن کو بڑے شوق سے کھولا تا کہ میں قرآن کریم کی سب سے پہلی آیت میں اس لفظ کے متعلق ان کی تحقیق سے مستفید ہوسکوں۔ لیکن یہ دیکھ کر مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے ''عٰلَمِیْنَ'' کا ترجمہ ''کائنات'' کرنے کے بعد اس پر ایک حرف بھی نہیں لکھا۔ لیکن اس کے بعد جب میں نے ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کے متعلق ان کی تفسیر کو دیکھا تو مجھے حیرت یا افسوس ہی نہیں ہوا۔ دُکھ ہوا۔ انہوں نے، ''الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' کا مفہوم بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وہ محسوس کرتا ہے کہ اُس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں تو پھر وہ اس معنی کا ایک اور لفظ بولتا ہے تا کہ وہ کمی پوری ہوجائے جو اس کے مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے

بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں بھی یہی نکتہ پوشیدہ ہے۔ رحمٰن عربی زبان میں بڑے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ لیکن خدا کی رحمت اور مہربانی اپنی مخلوق پر اتنی زیادہ ہے، اس قدر وسیع ہے، ایسی بے حدوحساب ہے کہ اس کے بیان میں بڑے سے بڑا مبالغہ کا لفظ بول کر بھی جی نہیں بھرتا۔ اس لئے اس کی فراوانی کا حقدار کرنے کے لئے پھر رحیم کا لفظ مزید استعمال کیا گیا۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ہم کسی شخص کی فیاضی کے بیان میں ''سخی'' کا لفظ بول کر جب تشنگی محسوس کرتے ہیں تو اس پر ''دانا'' کا اضافہ کرتے ہیں، رنگ کی تعریف میں جب ''گورے'' کو کافی نہیں پاتے تو اس پر چٹے کا لفظ اور بڑھا دیتے ہیں۔ درازئی قد کے ذکر میں جب ''لمبا'' کہنے سے تسلی نہیں ہوتی تو اس کے بعد ''تڑنگا'' بھی کہتے ہیں۔

(تفہیم القرآن، جلد اوّل، ص:44، طبع اوّل)

یعنی، مودودی مرحوم کے الفاظ میں، جب اللہ تعالیٰ نے رحمٰن کا لفظ استعمال کیا تو اس سے اس کا جی نہ بھرا۔ اس کی تسلی نہ ہوئی اس نے کچھ تشنگی محسوس کی تو اس پر رحیم کا اضافہ کر دیا۔ جیسے درازئی قد کے لئے ہم کہتے ہیں۔

لمبا تڑنگا۔ (تڑنگا مہمل ہے)

یہ ہے، مرحوم کے نزدیک رحمٰن کے ساتھ رحیم کے لفظ کے اضافہ کا فلسفہ۔ مجھے اس سے دکھ اس لئے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے رحمٰن اور رحیم کے دو الگ الگ الفاظ استعمال کر کے، نظریۂ ارتقاء کی جس عظیم حقیقت کو واشگاف کیا تھا، مودودی مرحوم کی تفسیر نے اسے مسل کر رکھ دیا۔ اس مقام پر اس کے لئے گنجائش نہیں، ورنہ میں اس سائنٹفک نکتہ کی وضاحت کر دیتا۔ سردست میں اتنا ہی عرض کروں گا کہ جو حضرات اس موضوع سے دلچسپی رکھتے ہوں، وہ پرویزؔ صاحب کی ''لغات القرآن'' میں (ر، ح، م) کے زیرِ عنوان رحمٰن اور رحیم کا فرق ملاحظہ کریں اور انہوں نے مفہوم القرآن میں، سورۃ الفاتحہ کا جو مفہوم بیان کیا ہے، اس پر ایک نگاہ ڈالیں، اور پھر دیکھیں کہ ان دو الگ الگ الفاظ (رحمٰن و رحیم) میں حقائق کی کتنی دنیائیں جھلک رہی ہیں!

فیصل آباد کے احباب کے لئے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین

فیصل آباد میں ہماری دو بزموں کے

علاوہ مندرجہ ذیل پتہ پر بھی مل سکتے ہیں۔



فون نمبر:

0322-6386991

حکیم عبدالمجید

ہاؤس نمبر P-1479 سٹریٹ نمبر 1، محلہ فتح آباد، فیصل آباد

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرحِ جاوید نامہ شائع ہوگئی!

مفکرِ قرآن غلام احمد پرویز علیہ الرحمتہ کے لیکچرز کی تحریر پر مشتمل اپنے انداز کی منفرد شرح جاوید نامہ شائع ہوگئی ہے۔ بڑے سائز کے 800 صفحات پر مشتمل اِس یکتائے روزگار شرح کی قیمت صرف ایک ہزار روپے ہے۔ ''جاوید نامہ'' کیا ہے اس کے متعلق پرویز علیہ الرحمتہ کی زبانی خود ملاحظہ فرمائیے:۔

''علامہ اقبالؒ کی فارسی کی کتاب ہے ''جاوید نامہ''۔ اگر آپ نوجوانوں کو اسلام کی تعلیم دینا چاہتے ہیں تو میں یہ عرض کروں گا' مبالغے کی بات نہیں ہے' یہ ایک کتاب ''جاوید نامہ'' پڑھا دیجئے لیکن اس کے پڑھانے کے لیے ایسے لوگوں کی یا ایسے شخص کی ضرورت ہوگی جو علومِ حاضرہ کے اوپر پوری دسترس رکھتا ہو۔ یہ بڑی جامع کتاب ہے اور میں سمجھتا ہوں یہ اقبالؒ کی فکر کا شاہکار ہے۔ تاریخ عالم پہ نگاہ' مذاہبِ عالم پہ نگاہ' سارے فلسفے کے اوپر نگاہ' الٰہیات کے اوپر نگاہ' سوشیالوجی کے اوپر نگاہ' تمدن کے اوپر نگاہ' نظام کے اوپر نگاہ' سب سے بڑی یہ چیز کہ قرآن کی گہرائیوں کے اوپر بڑی نگاہ۔ اگر کہیں یہ چیز نصاب کی اس انداز سے سامنے آئے پھر آپ دیکھئے گا کہ انہی نوجوانوں کی ذہنیت کیسے بنتی ہے اور کیا بنتی ہے۔ یہ جو چیز ہے کہ کوئی دوسری قوم آئے گی۔ بڑا حسین انداز ہے۔ اقبال کے الفاظ ہیں وہ اس انداز سے بات شروع کرتا ہے کہ یہ نظام آیا تو ملوکیت بھی گئی اور یہ پاپائیت بھی گئی اور سرمایہ داری بھی گئی یہ سب چیزیں انہوں نے اُڑا دیں۔ میرے دل کے اندر جو بات چھپی ہوئی ہے آج میں اسے بے نقاب کہہ دینا چاہتا ہوں۔ الفاظ نہیں مل رہے یہ کہنے کے لیے کہ میں کیا کہوں کہ یہ قرآن ہے کیا' یہ کتاب تو نہیں کچھ اور ہی ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ جب جان کے اندر کسی کے یہ اتر جاتی ہے تو جان بدل جاتی ہے اور جب جان بدل جاتی ہے تو دنیا بدل جاتی ہے''۔

(بحوالہ دروس القرآن سورۃ المائدہ آیات 51 تا 56)

منگوانے کا پتہ

ادارہ طلوعِ اسلام 25-B گلبرگ 2، لاہور۔54660، پاکستان
فون: 042-35714546 Idara@toluislam.com

***Manzil ba Manzil* (منزل بہ منزل)**

Chapter 3: Spring's Message (*Payam-e Fasl-e Bahar* پیام فصل بہار) –

Message to Fellow-Ambassadors

(Tulu-e-Islam Convention, November, 1959)

By G. A. Parwez (Translated by: M. Alam)

Episode No. 3

Only that progress and evolution will sustain in the long run in which all members of human family are equally respected and involved. Otherwise, a society no matter how advanced and evolved stagnates and suffers intellectual and cultural death and will descend into hell like other nations. The Quran has used the word جحیم (*Jaheem*) for hell which means stagnation. Whenever a nation starts stagnating that is when its hell begins.

Taste of laziness from action is self-imprisonment;
The hunter waylays its victim if its hands fold up!

This is the secret of progress and evolution that the Quran mentioned 1400 years ago, and which only now modern sociologists and anthropologists have started discovering it. But we do not have to go outside to seek the proof of it; the proof resides in our own house. That is, the history of the rise and fall of Muslims is a reflection of this reality.

Causes of our rise and fall

When a small group of individuals from the land of Hijaz understood the power of this Quranic wisdom then they created such a unified party – by removing all the distinctions of: ruler and ruled; high and low status; rich and poor; and Arab and non-Arab – with the underlying core principle that in every individual's effort and earning ability, all are equal participants. After the opening Surah the Quran has described the attributes of such individuals when it declares: وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ (2:3) – whatever We have provided for them they keep it open for the betterment of others. What is the limit of this opening? The Quran replies: وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ (2:219) – They also ask you as to how much they should spare for the help of others. Say: all that is surplus to your needs. *This* they were commanded to do. But they went beyond this: وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (59:9) – They always give preference to the needs of the others, even if they themselves are indigent and living a life of hardship.

Today, it has become a puzzle as to what is the economic system of Islam. And if someone is told that no surplus wealth remains with anyone in this system then he sees the germs of communism in this system. However, when the philosophy of evolution of human abilities as given in the Quran is understood, then there remains no mystery in understanding its economic system. As mentioned above, its philosophy is that a system in which an

individual, or a group, or a nation keeps to itself the output of its efforts, then the progress of that individual, that group, that nations stops; and it cannot move forward after reaching a certain point. The Quran calls this type of mentality as بخل (*Bukhl* or miserliness) and says: وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ؕ (47:38) – They should know that the one who is miserly in this matter, in fact, harms none but himself. He stops his own self's development. In contrast to this, a group or a nation develops itself further when it tries to help develop others: وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) – Whoever provides nourishment to others, he himself receives the same in return. This was the crux of the principle that that small group of the people of Hijaz had understood. The result was that their progress became limitless. There was neither any mystery, nor any puzzle, nor any ideology beyond understanding, nor any supernatural formula in this limitless achievement.

What happened later?

Well, the later followers abandoned that principled law of evolution. They restricted the wealth individually and within limits of their family. One group within the nation became the ruler and thus power and authority became limited within a particular group. And beyond this the entire nation imprisoned itself within its boundary walls of nationhood by ignoring the concept of universal brotherhood of humankind. This was the condition of worldly people. And the so-called people of God imprisoned themselves for "spiritual" progress within the walls of monasteries cutting themselves off from the rest of humanity. And on top this, the people of Sharia started telling that Islam's purpose is achieved if everyone became pious in their own boundary walls of individual religions. The result was that the nation of Islam as a whole stopped at the place where it was; and became fossilized in time capsule. This is the hell or جحیم (*Jaheem*) that the Muslim nation is in since that time. The meaning of stopping at one place is that intellectual abilities of such a nation become devoid of evolution. That is, that nation does not possess the abilities of thinking and rational understanding. How clearly the Quran describes this situation when it says: وَقَالُوْا لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْٓ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ ۝ (67:10) – Truly we did not utilize our intellect and ability to think; and we opposed him (the warner) with sheer prejudice and stubbornness. Had we listened to him attentively and used our intellect, we would not be in this Hell?

There is another point to note here. A nation that abandons its thinking at a certain point of its evolution deceives itself that *that* is its pinnacle of humanity; and that no other nation can reach that level. That is how it pretends itself that its hell is heaven; and does not want to get itself out of the hell it is really in. In other words, it does not see its hell. This is because one can only

see the prevailing hell only if one has the ability to see it: وَبُرِّزَتِ الْجَحِيْمُ لِمَنْ يَّرٰى (79:36) – Hell will become visible to those who are capable of seeing it.

***

Summary of our discussion until this point

This was, my dear friends, the related point that had come in the course of our discussion about why the Quran puts so much emphasis on universality of the humankind. Since we drifted somewhat from our topic, it seems necessary at this point to recap the story in few words in order to maintain continuity with what we were discussing until this point.

1. The difference between secular state and divine state is that to secular state the only thing counts is the protection of national interests; and political opportunism and expediency become the tools and policies to achieve them. On the other hand, the purpose for which the divine state strives is to protect the eternal principles or universal permanent values; and lays down policies and procedures to implement them in real life. The secret of humankind's welfare and benefit, and its progress and evolution lies in practical realization of these eternal principles.
2. These eternal principles are clearly spelled out in the Quran. The constitution of the Islamic state is built on these principles.

Fear and grief

The Quran has summarized in just few words the result of the divine state: فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (2:38) – those who will order their lives in accordance Our guidance, will suffer no fear and sorrow. Those who tread the life under the guidance of Allah's book will remain free of fear and free of grief.

To remain free of fear is political security and to remain free of grief is economic independence. There would be no political oppression of any kind in this state. There would be no economic dependence of any sort in this state. In the words of Iqbal:

There will be no dependence in this state of any kind;
This is the meaning of the clear Sharia, in a nutshell!

***

Form of government

As far as the form of government is concerned, the Quran has not given any specific details about it. But it does specify an eternal principle behind it: وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ (42:38) – They decide their affairs through mutual consultations and according to Divine Laws. Matters of state will be decided by mutual consultation of the Ummah in the light of the Quran.

The machinery of government will not reside under the control of any individual, or family, or group. This will remain under the collective trusteeship of the Ummah which will hand it to its representatives. And as has been mentioned earlier the standard for selecting Ummah's representatives will be: اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ (49:13) – According to the Divine Law the criteria to determine status or superiority is how closely and consciously one follows and guards the Divine Laws? And Who obeys Allah more? The one whose whole life will be in conformity with this criterion will be the most worthy of respect. The criterion for superiority in this state will not be race or status, but personal character and behavior.

Those who are the closest in obeying the laws of Allah will be the most respected. And these people will represent the Ummah who, by adhering to the boundary lines of eternal universal principles of the Quran, will form the detailed laws and will decide the form of government depending on the demands of the time and the circumstances.

My dear friends, you would have realized by now that Islamic government is not the name of any specific form or style of government. It is a means to protect and propagate the permanent values as determined by the Quran; and the government machinery is to practically establish and implement them. Whatever means are acquired to achieve this goal will be called Islamic provided that these means do not violate the principles of the Quran. By keeping the Quranic values intact, whatever style or form of government is adopted that will be Islamic.

Difficulties in constitution making

In the light of these explanations, my dear friends, could there be any difficulty in drafting and compiling an Islamic constitution? In this process all the difficulties that we encounter are our own – conscious or unconscious – self-creations. Our most fundamental mistake is that we take Islam (without thinking) as one comprising of rituals and Sharia laws of the period when the train of دین (*Deen*) was hijacked by kings and put on a different track. Unless and until we come out of this misunderstanding and keep accepting that version of "Islam" as the true Islam, even the concept of Islamic constitution won't appear before us. Those who are involved in this misunderstanding must understand that the religion of "Islam" that they are promoting; and the Sharia law that they are pushing for adoption as the state's constitution; and think that this way we will regain our standing as a developed nation among the community of nations – then they are gravely mistaken. What they are advocating is the non-Quranic religion in the name of Islam. The Quran's دین

دین (*Deen*) guarantees its followers the leadership of the world among its contemporary nations, let alone being in the ranks of developed nations.

The religion of the enliven hearts is not a pipedream;
They create another world from the dust of old realm!

And when it is the fact that our current religion is not the real Islam then asking its custodians to give us the Islamic constitution is nothing but self-deception.

Who knows who has told these naivetés?
One who picks up sword becomes Farhad!

Our scholars and Islamic constitution

The prerequisite for Islamic constitution is that one must have full comprehension of the permanent values of the Quran and be knowledgeable about the contemporary issues of the time. As for our Ulemas, the so-called Islamic scholars, they are devoid of both. Therefore, to turn to them for framing the Islamic constitution is fundamentally wrong. In the words of Iqbal:

What is nation; and what is leadership of nations?
How the Mullahs of ritual-based Islam could fathom?

The Quran says: إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا (4:58) – In order to establish the Quranic system, it is necessary to entrust responsibility to those who are capable of discharging it. Drafting a constitution requires huge responsibility. It is a great trust on behalf of the people. It cannot be entrusted to those who are not worthy of this trust. Otherwise, it will be a breach of trust. We made this mistake once and have been suffering for nine years. If we lose this opportunity again – which Allah has given us – to redeem ourselves, then our punishment will be much severe this time.

My dear friends, at this time I want to clarify one point. When I criticize the custodians of our present religion then it is not directed against any specific individual but to the institution of priesthood which has no place in Islam. As for individuals, there are many whom I respect very much because of their character and integrity.

***

If people become pious then State will become Islamic

In regards to Islamic constitution it is heard from certain quarters that if people become true Muslims; if they become pious; if they become honest – then the state will automatically become Islamic. This logic is very interesting. This is similar to saying to those who are in-charge of government: Please fix the machinery that runs the government so that the crimes and corruption disappears; so that respect for laws develops in people's hearts; so that they could live in peace and security. In reply to this the government will say: if people respect the laws; if they don't commit crimes and live life as peaceful citizens – then the government will automatically become good.

The Quran mentions a great point in regards to the above arguments. It says that as far as individual ethics is concerned it is found just about everywhere. No one advocates:

lying, stealing, deceiving, oppressing, exploiting people, etc. In contrast, it is encouraged everywhere that: be honest, don't steal, don't deceive, don't oppress, live a life of piety, etc. But, despite this, it is a fact that people do not practice what they preach. Religion only preaches; it only considers its duty to give sermons to people about piety and honesty. The Quran says that sermonizing is not enough. People won't become pious and honest by sermons only. It is not because the sermons do not have impact on people; it is not that people do not want to become honest and pious. Except few who are deliberately criminal minded, pathologically dishonest, and willfully transgressing; most people want to live life along the right path, but, despite this, they are not able to. It is not their fault in this. It is extremely difficult, if not impossible, to lead life on the right path in wrong and corrupt society. It may be the case that an individual may develop good personal qualities in his character; but in collective societal matters individual reform would never become effective. For this it is necessary to establish a society in which it is not only easy to lead life on the right, but that it should also be comfortable and satisfying. That is, just as it is extremely difficult, and one faces roadblocks after roadblocks at every step, to lead a right life in a wrong society; in the same way, in the right society, it becomes extremely difficult for a person to lead wrong life in a right society.

Just as water flows easily downstream, it becomes easier to lead life on the right path in a right society.

The Quran, the truth teller

The Quran tells the people of the book: مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ (4:47) – O Prophet (PBUH)! Tell these people of the book: that not only I have brought a Book, the Quran, which is the complete code of life, but also that it validates the claims made in your scriptures. For example, you say that oppressors will never be able to flourish. The Quran also says this: اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ۝ (6:135) – Allah never lets the oppressors succeed. But despite your sermons, oppressors continue to succeed. So, I have brought the practical program which actually proves that oppressors will not succeed. The name of this practical program is Islamic state. It is impossible for an individual to put the world on the right path. The forces of evil are so strong and so wide-spread that it is impossible to face them individually. The Quran teaches us to face the facts. That is why it does not tell something to individuals which is beyond their power.

The goal of mysticism

The Quran declares that mysticism is not from Allah, but it is an ideology created by human mind. This ideology does not mean that one need to go to jungle and lead a life of asceticism. The meaning of this ideology is to live individual life; to try to be pious on an individual basis. The Quran declares this type of life against Allah's will of leading a collective life. This is what it calls Islamic state.

How Islamic state makes people pious?

At this point let us make it clear that the Islamic state does force people to become pious. Force is used only against deliberate transgressors of laws. It has a different program for making normal people pious.

To Be Continued...

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔ شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔ جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔ اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہر حال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔ اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔ مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔ اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔ اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
11

Monthly

TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

